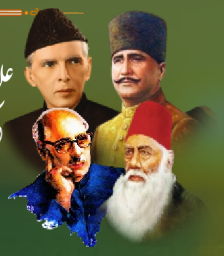
ماہنامہ
مارچ 2025ء
طلوعِ اسلام
لاہور
اشاعت کا اکیاسی واں سال

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

رمضان کریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوبِ تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبالؒ، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
مارچ 2025ء

جلد 78 | شمارہ نمبر 03

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: 23 مارچ	ادارہ	4
ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	علامہ پرویز علیہ الرحمہ	8
ایک شذرہ	جمیل احمد عدیل	14
ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے	علامہ پرویز علیہ الرحمہ	18
قیامِ پاکستان کے بعد پہلی عید کی کہانی پرویزؒ صاحب کی زبانی	محمد سلیم اختر خاں	37
مکتوبِ پرویزؒ بنام خالد گل صاحب	ادارہ	38
کیا قائداعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟	علامہ پرویز علیہ الرحمہ	40
قرآن اور سنت	محمد انور خان، اسلام آباد	49
اقبال کا شاہین ہو کہ پرویز کا سلیم	نفیسہ فریاد چاہل	51

ENGLISH SECTION

The Sunrise of Humanity (*Tulu-e Aftaab* طلوع آفتاب)
Meraj-e Insaaniyat (The Pinnacle of Humanity)
by G. A. Parwez (Translate by: Mansoor Alam) 57

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 600 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

23 مارچ

یوں تو ہر دن اللہ ہی کا ہوتا ہے لیکن بعض دنوں میں اس قسم کے عظیم الشان انقلاب واقع ہوتے ہیں کہ قرآن انہیں ''ایام اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی زندگی میں بعض دن ایسے آتے ہیں جن میں ان کا کاروان حیات ایک نیا موڑ مڑتا ہے اور اس سے ان کی قسمت کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ اس قسم کے دن قوموں کی زندگی میں یادگار بن جاتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں درخشندہ حروف میں لکھے جاتے ہیں مسلمانانِ ہندو پاکستان کی حیات ملی میں گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں کئی دن ایسے آئے ہیں جن کی یاد کو تاریخ اپنی آغوش میں محفوظ رکھے گی۔ ان میں سب سے پہلا یادگار دن 29 دسمبر 1930ء کا تھا جب الہٰ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں، حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنا وہ خطبۂ صدارت ارزانی فرمایا جس نے فی الحقیقت اس قوم کے مستقبل کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس سے پہلے مسلمانانِ ہند ایک راہ گم کردہ قافلے کی طرح پریشان و سرگرداں، ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کے پاؤں اٹھتے تھے لیکن نہ سراغ راہ ان کے سامنے تھا نہ نشانِ منزل۔ وہ ہر دور سے نظر آنے والے غبار کی طرف لپک کر بڑھتے تھے کہ شاید اس میں وہ ''شہ سوارِ اشہبِ دوراں'' ہو جو انہیں صحیح و سلامت منزل مقصود تک لے جائے لیکن اس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتے تھے کہ وہ غبار، بگولے کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس تشتت و انتشار اور یاس و حزن کے عالم میں اس حکیم الامت نے جسے قرآنی بصیرت نے دیدۂ انجم عطا فرمایا تھا، ان پراگندہ افرادِ کارواں کو پکارا اور نہایت حکمت و تدبر اور شفقت و محبت سے انہیں بتایا کہ ان کی منزل مقصود کیا ہے اور اس تک پہنچنے کا صحیح راستہ کونسا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے مخاطبین سے کہا کہ

> آپ نے مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے اس شخص کو منتخب کیا ہے جو اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ اسے پورا پورا یقین ہے کہ اسلام میں وہ قوت موجود ہے جو انسان کو اس کی تنگ نظری سے نجات دلا سکتی ہے جسے جغرافیائی حدود نے پیدا کر دیا ہے۔ جس کا ایمان یہ ہے کہ ایک فرد یا مملکت کی زندگی میں مذہب کی قوت بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اور جو (اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت) یقین رکھتا ہے کہ اسلام اپنی تقدیر آپ ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی حادثہ اسے تباہ نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے جو تم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت وطن کی حدود سے متشکل ہوتی ہے۔ ان کی قومیت کا مدار اسلام پر ہے۔

جس نے جذبات اور وفاشعاریوں کے وہ بنیادی اصول عطا کئے ہیں جو رفتہ رفتہ پراگندہ افراد اور منتشر گروہوں میں یک جہتی اور یک نگہی پیدا کر کے انہیں آخرالامر ایک متعین قوم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

قومیت کی ان نئی بنیادوں کی وضاحت کے بعد، وہ مسلمانانِ ہند کے مستقبل کو سامنے لائے اور کہا کہ

میں چاہتا ہوں کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک مملکت بنالیا جائے۔

انہوں نے اپنی اس آواز کے اظہار تک ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایمان و ایقان کی ایک ایسی آواز کے ساتھ جو دل کی گہرائیوں سے ابھرا کرتی ہے، پورے حتم و یقین سے فرمایا کہ

حکومت برطانیہ کے دائرہ کے اندر رہ کر ہو یا آزادانہ طور پر۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک مستحکم اور متحدہ مملکت کا قیام ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

یہ تھا نشانِ منزل (یعنی ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کا قیام) اور وہ تھا سراغِ راہ (یعنی وطنی، نسلی، لسانی نسبتوں سے بلند ہو کر، محض اسلام کی بنیادوں پر مسلم قومیت کی تشکیل) جو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اس پراگندہ فکر اور افسردہ خاطر قوم کے سامنے رکھا گیا۔ یہ دن، فی الحقیقت مسلمانانِ ہندوستان کی زندگی میں، ہمیشہ زندہ و تابندہ رہنے والا دن تھا۔

چونکہ ہر انقلابی آواز کی طرح یہ آواز بھی اپنے زمانے سے بہت آگے تھی اس لئے کسی نے اسے سنجیدگی سے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ لیکن زمانے کے تقاضے قوم کو کشاں کشاں اسی طرف لئے جا رہے تھے۔ انہی تقاضوں نے ان میں قائداعظمؒ جیسی شخصیت کو ابھار دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے، قومیت کے اس ''جدید'' تصور کے ماتحت، مسلمانانِ ہند کو ایک جداگانہ ملت کی حیثیت سے منظم کیا اور اس کے بعد ان میں اس منزل کے شعور کو بیدار کیا جس کا نشان اقبال نے ۱۹۳۰ء میں دیا تھا۔ چنانچہ چند ہی سال کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو، اسی حکیم الامتؒ کے مرقد کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ ہم ہندوستان میں اپنی جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہیں گے۔ یہ دن اس قوم کی کتابِ زندگی میں ستاروں کی روشنائی میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

اس عزم کے بعد، اس منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رہی تا آنکہ انہیں نہ صرف شمال مغربی بلکہ اس کے ساتھ ہی شمال مشرقی ہند میں بھی ایسا خطۂ زمین مل گیا جس میں یہ اپنے تصورات کے مطابق اپنی آزاد مملکت قائم کر سکتے تھے۔ یہ انقلابِ عظیم 14 اگست 1947ء کو واقع ہوا۔ یہ دن ان کی حیاتِ ملی میں ہزاروں مسرتوں اور لاکھوں شادمانیوں کا پیامبر تھا اور بلاشائبۂ تشکیک، قرطاسِ ارض پر سورج کی کرنوں سے مرصع کاری اور زرنگاری کا مستحق۔ اس طرح سترہ سال کے قلیل

عرصہ میں (جو قوموں کی زندگی میں پلک جھپکنے سے زیادہ کا عرصہ نہیں کہلا سکتا) ایک ''شاعر کا خواب'' خواب یوسف کی طرح حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ گیا۔

لیکن جہاں ایک طرف اس قوم کی قسمت کے ستارے یوں ایک ایک کر کے بیدار ہوتے جا رہے تھے تاریکی کا ایک گوشہ بھی اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا کہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا لیکن قبل اس کے کہ یہ حقیقت منتظر لباس مجاز میں سامنے آ جائے وہ ہم سے رخصت ہو گیا۔ پھر جناحؒ نے وہ خطۂ ارض حاصل کر لیا جس میں اس جدید مملکت کو متشکل ہونا تھا لیکن قبل اس کے کہ اس کی بنیادیں اس نقشے کے مطابق استوار ہوں۔ وہ بھی ہمیں الوداع کہہ گیا۔ اب قوم کے برسر اقتدار طبقہ کی حالت ان رئیس زادوں کی سی ہو گئی جنہیں بیٹھے بٹھائے ایک ریاست ورثہ میں مل جائے۔ اور عوام کی حالت ان یتیموں کی سی جن کا کوئی والی وارث ہی نہ رہے۔ چنانچہ اس عرصہ میں اوپر کے طبقے نے اس مفت میں ملی ہوئی ریاست کا جو کچھ حشر کیا اور نیچے کے طبقے کے ساتھ جو کچھ بیتی اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۸۲﴾ (9:82)

انہوں نے جو کچھ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے انہیں چاہئے کہ اسے دیکھ کر روئیں بہت زیادہ اور ہنسیں بہت کم۔

اقبال نے تخلیق پاکستان کی اہمیت یہ بتائی تھی کہ

ہندوستان میں بہ حیثیت ایک ثقافتی قوت کے اسلام کی زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ اسے ایک خاص خطہ میں مرکوز کر دیا جائے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ''یہ خطۂ زمین بیرونی حملہ آوروں کی مدافعت کا ذریعہ بن جائے گا خواہ وہ حملے توپ و تفنگ کے ہوں اور خواہ نظریات و تصورات کے۔'' اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ

اس سے اسلام کو اس کا موقع مل سکے گا کہ وہ اپنے آپ کو ان اثرات سے پاک اور صاف کر لے جنہوں نے اسے عربی ملوکیت کے زمانے میں ملوث کر دیا تھا۔ یہ اپنی تعلیم، اپنی ثقافت اور اپنے قوانین کو ایک طرف حقیقی اسلام سے اور دوسری طرف دور حاضرہ کے تقاضوں سے قریب تر کر سکے گا۔

یہ تھے وہ فوائد جو اسلام کو اس صورت میں حاصل ہونا تھے جب شمال مغربی خطہ ایک واحد مملکت بن جاتا۔ اب جبکہ ہم نے شمال مغربی خطہ کو ایک مملکت بنا لیا ہے، ہمارے پیش نظر ان مقاصد کا حصول ہونا چاہئے۔ یعنی ہم اس خطۂ زمین میں ایسا معاشرہ قائم کریں جو حقیقی اسلام (یعنی قرآن) کے اصولوں پر متشکل ہو اور ان اصولوں کی روشنی میں ہم ایسے جزئی قوانین مرتب کریں جو دور حاضر کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کر سکیں۔ اسی سے اسلام ان غیر اسلامی عناصر سے منزہ ہو سکے گا جو ہمارے دور ملوکیت کی یادگار ہیں اور جنہیں ہم غلط فہمی سے ہزار برس سے (حقیقی اسلام سمجھ کر) سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور اسی سے ہمارا دین ایک زندہ قوت بن کر دنیا میں ہماری حفاظت اور صیانت کا ذمہ دار بن جائے گا۔ اس لئے کہ (اقبال کے الفاظ

میں) تاریخ کے نازک ادوار میں' اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کو نہیں بچایا۔''

اقبالؔ نے اپنے مذکورۂ بالا خطبہ میں یہ بھی بتایا تھا کہ ہمارے زوال کی دو علتیں بالکل نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم میں صحیح ٹائپ کے لیڈر نہیں۔

> لیڈر سے میری مراد ایسے افراد ہیں جو اپنی خداداد بصیرت یا تجربہ کی بنا پر' اسلام کی روح اور اس کی غایت سے پوری طرح واقف ہوں اور دوسری طرف عصر حاضر کے تقاضوں کا بھی صحیح صحیح احساس رکھتے ہوں۔ اس قسم کے افراد درحقیقت قوم کے لئے ''خدائی قوت'' کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے بنے بنائے ملتے ہیں۔ آرڈر دے کر بنوائے نہیں جا سکتے۔

دوسری علت انہوں نے یہ بتائی تھی کہ ہماری قوم میں ''ملی شعور'' کی کمی ہوتی جا رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے ذاتی مفاد کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور ملت کے تعمیری کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں اس وقت کوئی لیڈر بھی ان خصوصیات کا حامل نہیں جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ جو لوگ فضا میں خلا کی وجہ سے مذہبی پیشوائیت کی مسندوں پر متمکن ہو گئے ہیں اور زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں انہیں نہ اس کا علم ہے کہ اسلام کی روح اور غایت کیا ہے اور نہ ہی اس کا شعور کہ عصر حاضر کے تقاضے کیا۔ لیکن اس کمی کو اس طرح پورا کیا جا سکتا ہے کہ ہم باہمی مشاورت سے اپنے تمام معاملات میں قرآن سے راہنمائی حاصل کریں اور اس کی روشنی میں عصر حاضر کے پیش کردہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں ہم کسی جگہ غلطی بھی کر جائیں۔ لیکن غلطیوں سے کبھی گھبرانا نہیں چاہئے۔ مزید تجربہ غلطیوں کی اصلاح خود بخود کر دیا کرتا ہے۔ باقی رہی قوم میں ملی شعور کی بیداری' سو اس کی واحد صورت وہی ہے جسے قرآن نے بطور اصل الاصول پیش کیا ہے۔ یعنی انفرادی مفاد کو کم از کم کر کے ملی مفاد کو زیادہ سے زیادہ کر دیا جائے۔ بالفاظ دیگر' رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت سے نکال کر ملت کی اجتماعی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ انہیں تمام افرادِ ملت کی نشوونما کے کاموں میں صرف کر سکے۔ قرآن نے اقوام کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم اصول بتایا ہے اور وہ یہ کہ پوری کی پوری قوم ایک فرد واحد کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ (31:28) اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ رزق کے سرچشموں میں افراد کا الگ الگ مفاد نہ رہے بلکہ پوری ملت کا مفاد مشترکہ ہو اور اس کے بعد کسی کے دل میں قطعاً یہ خیال نہ پیدا ہو کہ وہ سندھی ہے یا پنجابی۔ بلوچی ہے یا سرحدی۔ اگر اسلام لانے کے بعد بھی' امتیازاتِ رنگ و بو کے یہ بت ہمارے دلوں میں قائم رہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے دلوں میں ایمان نے گھر نہیں کیا۔ ہم بدستور مشرک کے مشرک ہیں۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (76:3)

علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟

سلیم! میرے مضامین پڑھ کر جو خیالات تمہارے دل میں پیدا ہوئے وہ بالکل فطری ہیں اور ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو قرآن کریم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرتا ہے اور جس کی نگاہ ان حقائق کی متلاشی ہوتی ہے جنہیں خدا نے اس کتاب مبین میں بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے اور جو قوموں کی تباہی و بربادی اور فوز و فلاح کے لئے غیر متبدل اور اٹل قوانین ہیں۔ تم میرے مسلک سے واقف ہو۔ میں قرآن کو مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ تمام نوع انساں کی انفرادی اور اجتماعی مشکلات کا واحد حل اور زندگی کے مصائب و آلام کا حتمی علاج سمجھتا ہوں اور میرا یہ عقیدہ محض خوش فہمی پر مبنی نہیں بلکہ میں علیٰ وجہ البصیرت اس کا یقین رکھتا ہوں، ایسا یقین جو وجہ اطمینانیت قلب اور باعث تسکین روح ہوا کرتا ہے، نہ کہ توہم پرستی کا پیدا کردہ فریب نفس جسے یقین اور اطمینان کا نام دے دیا جاتا ہے۔

تم پوچھتے ہو، اور ایسا پوچھنے میں تم بالکل حق بجانب ہو، کہ جب مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت آج نمازیں بھی پڑھتی ہے، روزے بھی رکھتی ہے، زکوٰۃ بھی دیتی ہے، حج کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے، تو ان اعمال کا وہ نتیجہ مرتب کیوں نہیں ہوتا جو عہد محمد ﷺ رسول اللہ والذین معہٗ (حضور نبیٔ اکرم ﷺ اور صحابہؓ کے عہد) میں ہوتا تھا۔ چونکہ تم فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ اصطلاحات میں الجھنے کے عادی نہیں، اور نہ ہی یہ طریق ان حقائق کو سمجھنے کے لئے چنداں مفید ہوتا ہے، اس لئے تمہیں کھلے کھلے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ آج ہمارے یہ ''اعمالِ حسنہ'' کیوں بے نتیجہ رہتے ہیں۔

سلیم! ذرا غور کرو کہ جاڑے کا موسم ہے۔ سخت سردی کا دن۔ شام کے قریب، جبکہ آفتاب کی شعاعوں میں تمازت باقی نہیں رہی، رحمت کی بیوی اپنے خوردسال بچوں کو لے کر اپنی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بیٹھی ہے۔ رحمت کی بیوی کو تم جانتے ہو؟ تم بچپن میں ان کے ہاں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ عمر کا تقاضا تھا کہ اس کے چہرے پر شگفتگی و شادابی ہوتی۔ لیکن مسلسل فاقوں نے اسے ایسی افسردگی اور پژمردگی میں بدل دیا تھا کہ وہ ایک اجڑا ہوا بہشت معلوم ہوتا تھا جس پر سوائے نورِ عصمت کے (جو ہر ایسی پاک دامن بی بی کے چہرے پر ہونا چاہئے) رونق اور زندگی، تازگی اور بشاشت کا کوئی نشان تک باقی نہ تھا۔ ہاں! وہ

اپنے بچوں کو لے کر چولہے کے قریب آ بیٹھی۔ خشک ٹہنیاں، سوکھے ہوئے پتے، خس و خاشاک، دوپہر کو اکٹھا کر لائی تھی۔ انہیں سلگا دیا تاکہ بچے آگ تاپتے رہیں۔ لیکن بچوں کو تو سردی سے زیادہ بھوک ستا رہی تھی۔ اس نے ان کے پیہم معصوم تقاضوں سے مجبور ہو کر ہنڈیا میں خالی پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا اور یوں، ان ننھے بچوں کو نہیں! خود اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ ہر آہٹ پر کان اور ہر جنبش پر نگاہ تھی۔ بچے اور ان کی ماں رہ رہ کر گلی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سورج ڈوب گیا تو گلی کے دوسرے کنارے سے رحمت آتا دکھائی دیا۔ ننگے پاؤں، پنڈلیاں گرد و غبار سے اٹی ہوئی، گھٹنوں تک پرانا تہمد، پھٹا ہوا گاڑھے کا کرتا جس کی آستینیں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں۔ بس، اس شدت کے جاڑے میں یہی کل کائنات، چہرے پر زردی چھائی ہوئی، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں، گھر کی طرف قدم اٹھاتا، لیکن قدم بمشکل اٹھتا۔ دروازے کے قریب آیا تو بیوی نے خاموشی سے بسم اللہ کہہ کر استقبال کیا۔ دونوں بچے ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بیوی نے ایک حسرت بھری نگاہ میاں کے افسردہ چہرے پر ڈالی۔ اس کی غم آلود آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ مجھے تو آج بھی کہیں مزدری نہیں ملی۔ دن بھر ادھر ادھر پھرتا، لوگوں کی منتیں خوشامدیں کرتا رہا لیکن کوئی کام نہ مل سکا۔

عین اس وقت سامنے کی مسجد میں خواجہ صاحب کی طرف سے دو ہزار روپے کا گراں بہا قالین بچھایا جا رہا تھا اور نمازی اسلام کی شوکت و عظمت پر ایک دوسرے کو مبارک باد اور خواجہ صاحب کو جنت کی بشارتیں دے رہے تھے۔

☆☆☆

سلیم! تم عنایت اللہ کو جانتے ہو نا! وہ تمہارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ کس قدر ذہین اور کیسا شریف بچہ تھا؟ لیکن بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کی ماں دن بھر محنت مزدوری کرتی اور بچہ کی پرورش کا سامان مہیا کرتی۔ لیکن جب مزدوری مردوں کو نہ مل سکے تو عورتوں کو مزدوری کہاں سے ملے؟ میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ صبح مدرسے جاتے وقت ماں نے بچہ کو چھاتی سے لگایا۔ آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ لیکن دل کو کڑا کر کے بیٹے کو تسلی دی کہ مدرسے سے ہو آؤ۔ بس تمہارے آنے پر روٹی تیار ملے گی۔ میں ابھی پکاتی ہوں۔ جاؤ میرا بیٹا! خدا حافظ!

سلیم! اگر ہمت ہو تو اس ماں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھو کہ بیٹے کو یوں بھوکا مدرسے بھیجتے وقت اس کے سینے میں کس قیامت کے جذبات غم و حزن کا طوفان برپا ہوگا۔ وہ غربت و فلاکت کا مجسمہ چپکے سے مدرسے چلا گیا۔ شام کو آیا۔ ماں گھر پر نہ تھی۔ شاید دانستہ باہر چلی گئی ہوگی کہ بھوکے بیٹے کو کس طرح دیکھ سکے؟ عنایت اللہ نے اندر آ کر سب سے پہلے روٹی والے رومال کو کھولا تو اس میں کچھ نہ تھا۔ خاموش باہر چلا گیا۔ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ سامنے خان صاحب کے مکان میں سینکڑوں مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ متنوع پھل، قسم قسم کی مٹھائیاں میزوں پر چنی رکھی تھیں کہ آج خان صاحب کے بچے کی پہلی افطاری کی تقریب تھی۔ یہ دو وقت کا بھوکا یتیم، انہیں دیکھتا ہوا چلا گیا کہ چوک میں کچھ بوجھ مل جائے تو ایک پیسے کے چنے لے سکے۔

سلیم! تم نے مائی بھولی کو دیکھا ہے؟ وہ اندھی بڑھیا جو پاگل ہو رہی ہے۔ لیکن تم نے اس کے بیٹے کو شاید نہیں دیکھا۔ اٹھارہ سال کا نوجوان بیٹا۔ اس کا باپ مدت ہوئی چالی پر سے گر کر مر گیا تھا۔ عمارت بنوانے والے نے دوسرے دن اور مزدور کام پر لگا لیا اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی کہ کس کا سہاگ لٹ گیا اور کون یتیم ہو گیا۔ اس بچہ کو مائی بھولی نے بڑی مشقت سے چرخہ کات کات کر پالا تھا۔ جس سال بڑے زور کا انفلوئنزا پھیلا تھا' وہ لڑکا بھی بیمار ہو گیا۔ محلہ میں ایک حکیم جی تھے۔ وہ غریبوں کو نسخہ مفت لکھ دیا کرتے تھے۔ بھولی وہاں سے نسخہ تو لکھوا لائی لیکن اٹھنی کے پیسے پاس نہ تھے کہ دوائی خرید سکے۔ سلیم! باور کرو کہ اس نے محلے کے ایک ایک گھر میں جا کر منتیں کیں کہ کہیں سے کچھ پیسے قرض مل جائیں۔ لیکن کسی نے کچھ نہ دیا۔ نسخہ ہاتھ میں تھا اور سامنے جوان بیٹا جان توڑ رہا تھا۔ بچارا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہ اس دن کا واقعہ ہے جس دن حاجیوں کی اسپیشل ٹرین روانہ ہوئی تھی اور سینکڑوں روپوں کے پھول اسٹیشن پر بکھرے پڑے تھے۔

☆☆☆

اور تم نے رضیہ بچاری کا پیغام تو اگلے دنوں خود اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ اسے جوان بھائی کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے لیکن اس کے پاس اتنے کپڑے نہیں کہ تن ڈھانپ کر گھر کی چار دیواری سے باہر نکل سکے۔ جب اس نے کپڑے بھی مستعار مانگے تھے تو ظاہر ہے کہ بچاری کے پاس زادِ راہ کیا ہوگا۔ اس نے گاؤں کے چوکیدار کو کہلا بھیجا کہ وہ اس کے ساتھ جائے لیکن جب اسے معلوم تھا کہ رضیہ کے پاس کچھ نہیں تو وہ بلا اجرت کیسے ساتھ چلا جاتا؟ گاؤں میں دور نزدیک کے رشتہ دار بھی تھے لیکن کسے فرصت تھی کہ اس کی مصیبت میں اس کے ساتھ ہو لے؟ سارا گاؤں فتو خاں نمبردار کے لڑکے کی شادی کی تیاری میں مصروف تھا۔ غریب اکیلی' چلچلاتی دھوپ میں پیدل روانہ ہو گئی کہ مرنے والے کا منہ تو دیکھ لے۔ (یہ وہی رضیہ تھی جس نے بچپن میں اپنے مرحوم باپ کی معیت میں جو (''شمش العلماء'' تھے' دو حج کئے تھے)۔ اور یہ اس گاؤں کا واقعہ ہے جس کے مسلمان مذہبی معاملات میں اپنے کٹر پن میں مشہور ہیں۔ لیکن وہ ''مذہبی معاملات'' کیا ہیں؟ ذرا سن لو۔ مقلد اور غیر مقلد کے جھگڑے تو وہاں شروع سے چلے آتے تھے۔ اس دفعہ جو میں وہاں گیا ہوں تو ایک اور جھگڑا سننے میں آیا۔ خود مقلدوں کے ہاں بھی دو پارٹیاں بن رہی تھیں اور آپس میں سر پھٹول تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک ''عظیم الشان'' مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے یہ تنازعہ پیدا ہوا ہے۔ کہیں سے ایک مولوی صاحب تشریف لائے۔ یہ مولوی صاحب بقول ایک گروہ کے بہت ''بھاری'' مولوی تھے۔ تین تین کوس تک ان کی آواز جاتی تھی۔ انہوں نے مسئلہ بیان کیا کہ مسجد کی شان رسولؐ اللہ کی شان سے بڑی ہے۔ کیونکہ رسولؐ اللہ خود مسجد میں چل کر آتے تھے اور مسجد کبھی ان کے پاس چل کر نہیں جاتی تھی۔ گاؤں کے مولوی صاحب کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ رسولؐ اللہ کی شان کو مسجد کی شان سے بڑا سمجھتے تھے۔ پھر کیا تھا' دو پارٹیاں بن گئیں۔ باہمی جھگڑے ہوئے' لڑائیاں ہوئیں' مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ قریب سال بھر ہو

گیا یہ آگ آگے ہی آگے بڑھتی جارہی ہے اور ہر فریق اس مساعی حسنہ کو ''جہاد عظیم'' قرار دے رہا ہے۔ اسی باہمی تشتت و انتشار کا نتیجہ ہے کہ کھیت ویران ہورہے ہیں۔ فصلیں تباہ ہوچکی ہیں۔ زمین کا بیشتر حصہ سکھوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ بقایا رہن رکھا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد تم دیکھو گے کہ سکھ تمام گاؤں کے مالک بن جائیں گے اور یہ ''دین دار'' مسلمان ان کے مزارعہ ہوجائیں گے۔ اس پر مولوی صاحب انہیں مبارک باد دیں گے کہ انہوں نے یہاں کی زمین بیچ کر بہشت میں مکان خرید لیا۔ اس لئے یہ سودا خسارے کا نہیں۔

تم کہو گے کہ یہ تو جہلا کی باتیں ہیں۔ لیکن تمہیں وہ خطبہء جمعہ بھی تو یاد ہوگا جو شہر کی جامع مسجد میں شعبان المعظم کے مبارک مہینے کی تقریب پر تم نے خود سنا تھا۔ جناب خطیب نے' جو خدا کے فضل سے دیوبند کے فارغ التحصیل مولوی صاحب ہیں اور جن کے پاس اپنے بیان کی تائید میں سینکڑوں حوالے بھی موجود تھے' یہی فرمایا تھا نا کہ ''شب برات'' ایک ایسی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ پکار پکار کہتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے جو جی میں آئے مانگیں۔ میں ہر ایک کی طلب کو پورا کروں گا۔ لہٰذا جس شخص نے اس رات میں پچاس نفل پڑھ کر مغفرت کی دعا مانگ لی اس کی نجات کا اللہ تعالیٰ خود ذمہ ہے''۔ اس کے بعد تمہیں یاد ہوگا کہ مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انہوں نے فرمایا تھا کہ رحمت خداوندی کے اس بحر ذخار میں ہر ایک کا حصہ برابر ہوگا۔ لیکن ایک سوختہ بخت اس سے محروم رہ جائے گا۔ لوگوں کی آنکھیں اوپر کو اٹھیں کہ معلوم کریں کہ وہ کون بدنصیب ہوگا جو ابر رحمت کی ایسی گہر باری سے فیض یاب نہ ہوسکے گا؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہاں ایک' اور صرف ایک شخص اس رحمت سے محروم رہ جائے گا۔ یعنی وہ جس کا پاجامہ اس کے ٹخنوں سے نیچے ہوگا۔ یہ تو سلیم! ''جہلا'' کی باتیں نہ تھیں اور نہ ہی مولوی صاحب یہ کچھ اپنی طرف سے بیان کررہے تھے۔ انہیں یہ سب کچھ ''عین اسلام'' کہہ کر پڑھایا گیا تھا اور وہ اسی کو ''عین اسلام'' سمجھ کر آگے پہنچا رہے تھے! ہاں! تو میں تمہیں رضیہ بی بی کی بپتا کی داستان سنا رہا تھا اور ایک رضیہ ہی پر کیا موقوف ہے۔ ذرا اپنے گردوپیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ اس قسم کے کتنے واقعات ہر روز تمہارے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔ سو عزیزم! جس سوسائٹی کا نظام یہ ہو اس کے متعلق یہ سوال اٹھانا کہ ان کی نمازیں اور ان کے روزے' ان کی زکوٰۃ اور ان کے حج یعنی ان کے ''اعمال حسنہ'' وہ نتائج کیوں نہیں پیدا کرتی جو ہونے چاہئیں تھے' کچھ تعجب انگیز نہیں۔ سلیم! میں پھر کہتا ہوں اور تم اسے غور سے سمجھنے کی کوشش کرو کہ اسلام ایک نظام زندگی ہے۔ دنیا کے مذاہب جن میں انسانی تصرفات ہوچکے ہیں' مذہب کو محض انفرادی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام ایک ایسا معاشرہ (سوسائٹی) قائم کرنا چاہتا ہے جو نوع انسان کی ربوبیت (پرورش) کا ذمہ لے۔ اس مقصد عظیم کے لئے اسلام ہر عبد مومن کو اس کارگہء حیات کی عظیم الشان مشینری کا اہم اور کارآمد پرزہ قرار دیتا ہے جس کی ہر حرکت اور جنبش کا اثر تمام مشینری پر پڑتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ صالح (محکم اور درست) ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مشینری بھی ایک ضبط و ربط کے ماتحت چلے اور اس کا جیتا جاگتا نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آجائے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ الگ پڑے رہیں تو خواہ ان میں سے ہر ایک پرزہ الماس و یاقوت کا کیوں نہ

ہو' مشینری بیکار ہو جائے گی۔ آج ہماری مشینری بیکار ہو رہی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس عملی رہبانیت کا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی ہے۔ سلیم! غور سے قرآن کریم کا مطالعہ کرو تو تم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ کسی قوم پر ذلت و مسکنت اور افلاس و نکبت کا چھا جانا اور پھر اس قوم کا اس حالت پر مطمئن ہو جانا' خدا کا غضب ہے' اللہ کا عذاب ہے۔ اور یہ تو تم سمجھتے ہی ہو کہ ایک مغضوب علیہ قوم محض بے روح نمازوں اور رسمی روزوں کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منعم علیہ قرار نہیں دے سکتی۔ جب اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح سے استخلاف فی الارض کی زندگی عطا کرے گا تو ظاہر ہے کہ جس ایمان و عمل کا نتیجہ شوکت و عظمت' تمکن و استخلاف نہیں (یا وہ اس حالت کی طرف رفتہ رفتہ نہیں لئے جا رہے) وہ ایمان' ایمان اور وہ عمل' عمل صالح نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا تم کسی اور نتیجے تک پہنچ ہی نہیں سکتے' کیونکہ اللہ کے وعدے تو بہر حال سچے ہیں اور اس کا قانون اٹل۔ سلیم! ذرا انسانیت کے معراج کبریٰ' یعنی دور رسالتؐ کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ وہ کون سا خاص پروگرام تھا جسے کانفرنسوں اور انجمنوں نے مرتب کر کے قوم کے سامنے رکھا تھا؟ یہی نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ ہی تو تھا جس نے چند سال کے عرصے میں نہ صرف اس قوم کی تمدنی' اخلاقی اور معاشرتی حالت ہی میں انقلاب پیدا کر دیا' بلکہ ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی اور کھجوروں کے ستو کھا کر گزارہ کرنے والی قوم' قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی وارث بن گئی۔ ان ہی سیدھے سادے اعمال نے ان کے اندر وہ انقلاب پیدا کر دیا جو ایک مرد مومن کی نگاہ میں تقدیریں بدل دینے والی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تمام اعمال درحقیقت مختلف اجزاء تھے اس پروگرام کے جس کا عنوان (یعنی مقصود آخر) قرآن کے پہلے چار الفاظ پر مشتمل ہے۔ یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (1:1) وجہ ستائش اللہ کا وہ پروگرام (نظام) ہے جو دنیا میں خدا کی ربوبیت عامہ (نوع انسان کی پرورش و تربیت) کا مظہر ہے۔ لہٰذا' جو اعمال اس نظام کے قیام کا ذریعہ نہیں بنتے وہ بے روح رسموں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔

☆☆☆

سلیم! ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر سمجھ لو کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ اعمال اسلامی کا ماحصل محض اسی دنیا کی فلاح و کامیابی' غلبہ و تسلط ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کی بادشاہت اور فرعون کی حکومت میں فرق کیا ہوا؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعمال اسلامی کا لازمی اور فطری نتیجہ اس دنیا میں حکومت و سطوت اور شوکت و عظمت کی زندگی بھی ہے اور اس کے بعد کی دنیا میں سرخروئی اور آبرومندی کی زندگی بھی۔ اگر ہمارے اعمال اس دنیا میں شوکت و عظمت پیدا نہیں کرتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے اعمال اسلام کی میزان میں پورے نہیں اترتے۔

☆☆☆

سلیم! تم پوچھتے ہو کہ بال آخر یہ عذاب کی زندگی ہم پر مسلط کیوں ہو گئی۔ حیران ہوں کہ تم اب تک اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکے۔ اس سے تم متفق ہو گے کہ قرآن کا مقصد لوگوں کو تمام خود ساختہ سلاسل و اغلال سے آزاد کر کے ان سے صرف

قانون خداوندی کی اطاعت کرانا تھا۔ لیکن سلیم! تم ذرا اپنی تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھو کہ جس انسانی استبداد کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا' کن کن شاہراہوں سے وہی استبداد امت پر مسلط کیا گیا۔ اور قیامت یہ کہ اس استبداد کا تسلط بیشتر مذہب کی آڑ میں ہوا اور ہر وہ طوق جسے اتار پھینکنے کے لئے قرآن آیا تھا اسے عین اسلامی بنا کر مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ تم سمجھتے ہو کہ خدا کی میزان میں یہ جرم کچھ ایسا کم وزنی تھا کہ یونہی معاف کر دیا جاتا؟ امم گذشتہ جن جرائم کی پاداش میں ذلت و مسکنت کے عذاب میں گرفتار ہوئی تھیں' کیا وہ اسی قسم کے جرائم نہ تھے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ فطرت کسی کی سوتیلی ماں ہے کہ وہ ایک بچے کے ساتھ ایک قسم کا اور دوسرے کے ساتھ دوسری قسم کا سلوک کرے گی۔ اس کے قانون اٹل ہیں اور ان کا ہر ایک پر یکساں طور سے اطلاق ہوتا ہے۔ پہلوں نے یہی کچھ کیا تو ان پر عذاب آیا۔ جب مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا تو ان پر عذاب کیوں نہ آتا؟ ان پر تو بلکہ اور بھی زیادہ سختی سے عذاب آنا چاہئے تھا کہ ان کے پاس قانون خداوندی کا ضابطہ اپنی اصلی اور مکمل شکل میں راہ نمائی کے لئے موجود تھا' لیکن انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا۔ کیا اس کی سزا اس سے کچھ مختلف ہونی چاہئے؟ انہیں وراثت کتاب کے لئے منتخب کیا گیا۔ نوع انسان کے لئے بہترین امت قرار دیا گیا۔ لیکن سب ایمان و عمل کے بدلے میں' نہ صرف نام رکھوانے کے عوض۔ اس کے باوجود تم پوچھتے ہو کہ اس قوم پر خدا کا عذاب کیوں مسلط ہوا؟ سلیم! اخوت' مساوات' حریت' وحدت انسانی' جماعتی زندگی' مرکزیت' اطاعت' فرد کا ملت کے لئے سب کچھ کرنا اور ملت کا افراد کی ربوبیت کا سامان فراہم کرنا۔ یہ تھیں نظام حقیقی کی خصوصیات۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اس منشاء الٰہی کو کب سے بھولے ہوئے ہیں۔ چھوڑ دو ابتدائی دور ہمایوں کے مختصر سے زمانے کو اور اس کے بعد قرآن کریم کی کسوٹی سے پرکھتے جاؤ امت مسلمہ کے ایک ایک عمل کو۔ حقیقت تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائے گی۔

لیکن بایں ہمہ' عزیزم! ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ جس قرآن کی رو سے ایک مرتبہ وہ نظام قائم ہوا تھا وہی قرآن آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر آج بھی مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں تو پھر دیکھو ان کی نمازیں اور ان کے روزے کس طرح وہی نتائج پیدا کرتے ہیں جن کے دیکھنے کے تم اور ہر دردمند مسلمان متمنی ہے۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝۹۶ (96:7) ''اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے قوانین خداوندی کی صداقت کو جھٹلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے قانون مکافات نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑ لیا۔'' اس ایمان و تقویٰ کی حقیقت تمہیں قرآن کریم سے ملے گی' بشرطیکہ تم اسے' تمام غیر قرآنی تصورات کو ذہن سے نکال کر سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس لئے کہ ؎

کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں
سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک (اقبال)

والسلام (نومبر 1939ء) (ماخوذ ''سلیم کے نام'' مطبوعہ طلوعِ اسلام ٹرسٹ)

جمیل احمد عدیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک شذرہ

علامہ جی اے پرویز عظیم مفکر جنہوں نے قرآن مجید کے معارف بیان کرنے کے لیے اپنی زندگی پیہم وقف کیے رکھی ۔۔۔آسمانی متن میں بار بار ابھرنے والے تعارض کے نقش سویدا کو جس طرح انھوں نے الگ کیا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی ۔۔۔ وگرنہ اب جو استفسارات کی یورش پوری توانائی کے ساتھ سامنے آ رہی ہے، عقلی تعبیرات کی پناہیں تراشنے والے صاحبان بے بس سے دکھائی دیتے ہیں ۔۔۔ پورا زور صرف کرتے ہیں لیکن ان کے بیانیے superficiality کے مظہر ہی بنتے ہیں ۔۔۔ممکنہ تنقیدات کے وسیع منظر نامے کو مدنگاہ رکھ کر تفسیر کرنا بے حد دشوار امر ہے ۔۔۔اسی لیے اکثر منقول عبارتوں ہی سے مواد کا وزن پورا کر دیا جاتا رہا ہے ۔۔۔عہد موجود جن قضایا کو سوال بناتا ہے، اسے ایڈریس کرنے کا ملکہ پرویز صاحب میں سب سے بڑھ کر تھا، پھر پوری جرات کے ساتھ انھوں نے اپنے narratives قارئین کے روبرو رکھے وگرنہ متعدد rationalists مصلحتوں کے شکار بھی دکھائی دیتے ہیں، وہ priesthood کا پریشر برداشت نہیں کر سکے ۔۔۔اس طرح نیمے دروں نیمے بروں کے پیشکار نظر آتے ہیں ۔۔۔لغات کے در بند کر کے روایت کو حظیرہ بنانے میں بہرحال ایک سہولت اور تحفظ تو میسر آتا ہے اور اسی سائبان تلے امان طلب کرنے والوں نے جانتے ہوئے بھی تحقیق کے معروضی تقاضوں سے اغماض برتا ۔۔۔ پرویز صاحب کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے etymological perspectives کی لطافتوں کو اساس بناتے ہوئے معانی کی ان طرفوں کو جزو شعور بنایا جن میں اپیل کی مقدار بہت زیادہ ہے ۔۔۔یوں نہیں کہ پرویز صاحب سے علمی اختلاف کی کوئی گنجائش سرے سے ہی موجود نہیں، ان کے موقف کے برعکس نقطہ نظر کے امکانات بدستور اپنی ہونیت کا اثبات کرتے رہیں گے لیکن تاسف اس بات پر ہوتا ہے کہ ان کے خلاف علمی فکری بنیادوں پر بہت ہی کم کم مقدمہ قائم کرنے کی مساعی ہوئیں، ساری جنگ سماجی محاذ پر لڑی گئی ۔۔۔ بلاشبہ یہ وہ مجرب نسخہ ہے جس کے حصے میں بالعموم شکست نہیں آتی ۔۔۔رائے عامہ کی ساخت اکثر اسی کے زیر اثر وجود پذیر ہوتی رہی ہے اور وہ دہائیوں بل کہ صدیوں تلک موثر رہنے کا چمتکار دکھلانے میں بامراد ٹھیرتی ہے ۔۔۔ پرویز صاحب بھی مذکورہ propagation کا بہت زیادہ نشانہ بنے،

یوں ان کا غیر معمولی اور نہایت وقیع علمی کام ویسے سامنے نہ آسکا، جس کا وہ حق دار تھا۔۔۔ مستقبل میں روایتی دھرم کا رقبہ مسلسل سمٹے گا، یہ طے ہے کہ defacto سطح پر دوسرے طرز حیات تیزی سے اپنی جگہ بنا رہے ہیں۔۔۔ لیکن کبھی انسانیت نے دین کی مانگیں اپنی ذوات میں محسوس کیں اور مادیت کی obvious دین یعنی اس لازمی vacuum نے وجود کے بحران کو نشان زد کیا تو اس اذیت کی پہچان ذات کی نشوونما کا مطالبہ کرے گی، فرد کے لیے اس سے گریز ممکن نہیں رہے گا۔۔۔ واضح رہے اس صورت حال میں رسمی اور ادو وظائف اور تقشّف کی ماورائیت کارگر نہیں رہے گی کہ سائنسی ترقی اور کائناتی حقائق کو منہا کر دکھانے کا شعبدہ کسی خطیب، کسی راہب، کسی پیشوا، کسی صاحب خانقاہ، کسی پیر حرم کے لیے ممکن نہ ہوگا کہ اب جگنو کی روشنی کو دن کی روشنی میں پرکھنے کی ذہن سازی ہو چکی، اساطیری صداقتوں کی چھان پھٹک کے لیے منہاج تیار ہو چکے، اب قصے کہانیوں سے سچائیوں کو blurr کرنے کی کاریگری دم توڑ رہی ہے۔۔۔ اب بصیرت کی تفریق پر کسی بھی پرکشش عنوان سے خطابت اپنا جادو نہیں جگا سکے گی۔۔۔ درحقیقت وقت کی گزران اتنا بڑا سچ ہے کہ فرد کے لیے مفر کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہتی۔۔۔ جو بلٹ بیرل سے نکل چکی، اس کی واپسی گمان ہی میں ہوسکتی ہے۔۔۔ گزران کو کون بدلے گا؟ کون بدل سکتا ہے؟ کہ یہ قانون فطرت ہی کے خلاف ہے۔۔۔ بس اسی کو پرویز صاحب نے خدا کے قانون سے تعبیر کیا ہے۔۔۔ اب اگر دین کی اور مراجعت ہوئی تو وہ اللہ کے قوانین کو تسلیم کر کے ہی ہو پائے گی۔۔۔ پرویز صاحب کے سارے کام کا crux ہی یہ ہے کہ کائناتی قوانین صرف اور صرف خدا کے وضع کردہ ہیں۔۔۔ یہ امکان ضرور ہے کہ اپنے وقت کا کوئی عالی دماغ بھی کسی قانون کی تفہیم میں ٹھوکر کھا جائے مگر اس کی غلطی سے قانون کی اصل ماہیت تبدیل نہیں ہو جائے گی۔۔۔ یوں اصل کی اصل کنہ تک رسائی کی متواتر جہد ہی کسی صاحب عقل و بصیرت کی تمنا ہونی / رہنی ناگزیر ہے۔۔۔ فکر کا یہ نادر پہلو روایتی مذہب کی رد تشکیل پر مامور ہے۔۔۔ اجمال کا تقاضا اپنی جگہ مگر اس مقام پر دو مزید جہتیں اشاراتی نکات میں بیان ہونا چاہیں گی۔ ایک تو یہ کہ پرویز صاحب سرمایا دارانہ نظام کے مضمرات پر مدت مدید ترجیحاً مرکوز رہے کہ اس سسٹم کے اصل مقاصد و اہداف کیا ہیں۔ ان ہی کے بیان کردہ اصول تصریف کی روشنی میں ان کی تصانیف کا جائزہ لیا جائے تو وہ اپنی اس فکر کا اعادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ سرمایا داری افراد و اقوام کے لیے مآل کار تو سم قاتل ثابت ہوگی مگر اس کی جاری ہلاکت خیزی استمراری نوعیت بھی رکھتی ہے۔ مطلب یہ کہ بظاہر یہ گلشن کا کاروبار منفعت بخش ہے اور اس سے جڑی ترقی بھی چکا چوندھ کی حامل ہے لیکن دنیا میں موجود اقتصادی تعدی اسی کا مسموم ثمر ہے۔ انہوں نے اپنی نگارشات اور گفتگوؤں کے ذریعے متنوع پیرائیوں میں واضح کیا ہے کہ قارون (سرمایا دار) اکیلا عامل نہیں۔ اسے فرعون (حاکم/سلطان) اور ہامان (مذہبی پیشوا) کی بھرپور عملی تائید بھی میسر ہے۔ یوں تو فوز و فلاح پر دنیا کے ہر انسان کا خلقی حق ہے، اس لیے سب کو سوچنے کی ضرورت ہے لیکن خاص طور پر مذہبی ریاستوں میں مقیم باشندوں کو جاننا چاہیے کہ معیشت کے تناظر میں ان کے بنیادی انسانی حقوق تلف کرنے والے عناصر کون ہیں؟ ارضی وسائل کے سرچشموں پر کون قابض ہیں؟ اس استحصال کے عقب میں کون کون سے طریق واردات بروئے کار

لائے جاتے رہے ہیں؟ جب وہ صاف ذہن کے ساتھ تدبر کریں گے تو ساری صورت حال ان پر کھل جائے گی کہ نعمائے حیات کو روک لینے والے ہاتھوں کے پیچھے یہی مثلث فعال ہے۔ پرویز صاحب نے اس کا حل نظام ربوبیت کی صورت پیش کیا ہے۔ اب یہ نظام ربوبیت ہے کیا؟ تو امر واقع یہ ہے کہ اس کا مکمل تجربہ ابھی کسی خطے میں سامنے نہیں لایا جا سکا۔ ہاں! اس کے اساسی خدوخال اپنے جزوی اطلاق کا نمونہ ضرور پیش کرتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ آگے بڑھنے کا حیران کن پوٹینشل رکھتا تھا مگر پھر گاڑی کا کانٹا بدل دیا گیا، یعنی ملوکیت کے ٹریک پر رواں ہو جانے کے سبب راستے اور منزلیں ہی اور ہو گئیں۔ بہر رنگ قرآنی تعلیمات کی رو سے انھی اپلائیڈ صورتوں کو مرکزہ مانتے ہوئے اس مفکر نے بڑی ہی کاوش کے ساتھ جو تھیوری وضع کی ہے وہ نظام ربوبیت سے معنون ملتی ہے۔ جس میں طبقاتی فروق کو مٹانے یا minimize کرنے کی خاطر جس جذبۂ محرکہ کو نیوکلیس بنایا گیا ہے وہ سوشلزم سے یکسر مختلف ہے۔ معاش سے وابستہ مقتضیات کو نشان زد کرنے کے لیے انہوں نے قرآنی قصص سے پہلی بار مدد لی ہے۔ یوں جن نئی تعبیرات سے مضبوط منطقی متن بنائے ہیں وہ مندرجات ان کے خلاق ذہن پر برہان ناطق قرار پائیں گے۔ یہاں صرف ایک اشارا! حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی والا واقعہ جس تفسیر میں ڈھلا ہے وہ اپنی اثر پذیری سے قاری کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ اس ضمن میں دوسری جہت عقیدۂ آخرت کے سرنامے سے مضمون ہوئی ہے۔ پرویز صاحب آخرت کا ہرگز انکار نہیں کرتے مگر وہ اسے غیر مبہم اسلوب میں اس کے دو حصے کرتے ہیں۔ ایک تو وہی ٹریڈیشنل آخرت جو یوم موعود یعنی قیامت کے دن برپا ہوگی، جب سب جی اٹھیں گے۔ دوسری آخرت کو انھوں نے اسی دنیا میں ظہور پذیر ہونے والی نتائجیت سے موسوم کیا ہے۔ ان کی نظر میں یہ دنیا cause and effect کے محور پر اصرار کرتی ہے۔ نتائج آفرینی ایک عجیب تعامل ہے جو کسی مرحلے میں بھی معطل نہیں ہوتا۔ چاہے یہ کتنا ہی غیر محسوس کیوں نہ ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ پرویز صاحب Butterfly effect کی معنویت کو کامل لطافت کے ساتھ جزوِ شعور بنا چکے تھے۔ اب اس فہم کی فراہمی پرویز صاحب کا ایسا گناہ نہیں تھا جسے معاف کر دیا جاتا۔ بغاوت کا یہ جرم ان کے نامۂ اعمال میں درج ہو کے رہا۔ اس صراحت کو فاضل ہی سمجھنا چاہیے کہ مکافاتِ عمل کے قانون کو نظر انداز کر کے جملہ فیصلوں کو آخرت میں موخر کر دینا۔۔۔ کسے بینیفیشری بناتا ہے۔۔۔ انصاف کو معرض التوا میں ڈالنا ایسی دراک عیاری ہے کہ نظیر عنقا! اور وہ عدالت بھی کب کام کرے گی لاکھوں سالوں کے بعد! یہی وہ زریں شاخ تھی جس سے جڑ کر زر و جواہر کے انبار لگائے گئے اور عظیم الشان محلات تعمیر کرائے گئے۔ شراب اقتدار کو جرعہ جرعہ نوش جاں کرنے کا شغل اپنایا گیا۔ توارث۔۔۔ جی ہاں! تاج و تخت کو بڑے محفوظ بندوبست کے ساتھ اپنی نسلوں میں منتقل کیا گیا۔ ستم یہ کہ سلطانیٔ جمہور میں بھی وہی مجرب روش سب کے مشاہدے کا حصہ ہے۔ ادھر رعایا کو گھٹی پلائی گئی کہ یہ مال و دولت دنیا تو نری آزمائش ہے، یہیں رہ جانے ہیں یہ سنگ و خشت کے دلکش مجموعے۔۔۔ سب ٹاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا! آگے بہشت میں تمہارے لیے دودھ اور شہد کی نہریں تیار ہیں۔ سونے اور چاندی کے گھر تمہارے منتظر ہیں۔ حور و قصور پر مبنی اس سہانے سپنے نے ایسی فینٹسی کو فروغ دیا کہ قناعت کے

نام سے بے عملی نے ڈیرے ڈال لیے۔ ایسے میں تقدیر کے روایتی تصور نے اپنے حصے کا کام کیا۔ یوں سڑے ہوئے چمڑے اور ابھری ہوئی پسلیوں کے ساتھ مزدور لقمۂ تر کو ترستا رہا؛ سلیوری نے ٹائٹل بدل لیا مگر غلامی اپنی بدترین شکلوں میں آج بھی موجود ہے۔ اس پر مستزاد یہ بھی کانوں میں انڈیلا گیا کہ اگر اس دنیا میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوگئی ہے تو کوئی مسئلہ نہیں! Day of judgment کو تمام حساب چکا دیے جائیں گے۔ تمھیں انصاف مل جائے گا اور زیادتی کرنے والے کو دوزخ میں دھکا دے دیا جائے گا۔ اب اسی دنیا میں آخرت کے ایک فیز کا مطالبہ کرنا اور ایسے مرکزِ ملت کے قیام پر مصر ہونا جس میں مظلوم کو اس کا حق ملے اور نادار مالدار کی ناجائز ثروت پر سوال اٹھائے بھلا کب سہا جا سکتا تھا! یوں مزاحمت پر آمادہ کرنے کی تقصیر پر محولہ تکون نے مثالی یگانگت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے مفکر کو تو کارنر کرنا ہی تھا۔ یہی پرویز صاحب کی فکر کا جوہر ہے۔۔۔ اس تناظر میں فکرِ پرویز علامہ غلام احمد پرویز کی شخصی حیثیت میں نہیں سمٹتی، اسے آگے بڑھنا ہے۔۔۔ اس کونٹیکسٹ میں پرویز صاحب منزل نہیں نشانِ منزل قرار پائیں گے۔۔۔ رواں زماں میں علامہ جی اے پرویز وہ بیکن ٹاور ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ انہیں دنیا سے گئے چالیس برس بیت چکے، اب تعصّبات کو ایک طرف رکھتے ہوئے ان کی علمی منزلت کا اعتراف ہونا چاہیے۔۔۔ یہ ان کا حق ہے۔۔۔ اور ان کا یہ حق بہرحیث انہیں مل کر رہے گا!!!

سانحہ ارتحال

انتہائی دکھ اور افسوس کیساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ بزم طلوع اسلام سوات کے ایک فعال بزرگ رکن محمد ایوب صاحب عرف غوریجو مولوی صاحب وفات پا گئے۔ مرحوم انتہائی مخلص، نڈر اور صاف گو انسان تھے۔ انہوں نے درس نظامی کے بعد مولانا پنج پیر سے بھی درس قرآن لیا ہوا تھا۔ مگر انہوں نے اس علم کو قرآن کریم کی تبلیغ کے لئے وقف کر رکھا تھا اور خود اپنی زمینوں میں باغات اور فصلیں کاشت کیا کرتا تھے۔ جب بھی کسی نے تحریک طلوع اسلام کے خلاف کوئی سازش کی تو مولوی صاحب مدمقابل ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ہر وقت مخالفت کا سامنا کیا کرتے تھے۔ وہ انتہائی باوقار طریقے اور دلائل سے مدمقابل کو خاموش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی خدمات کو حلقہ طلوع اسلام میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مولوی محمد ایوب صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عنایت فرمائے۔

غمگسار

خورشید انور

پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

15 دسمبر 1968 کو بتقریب جشنِ نزولِ قرآن ۔ عیدالفطر

خصوصی درس قرآن کریم

آسمان سے رزق:

بنیادی طور پر لفظ عید کے معنی ہیں بار بار لوٹ کر آنے والا واقعہ' لیکن اصطلاحاً اس سے مراد ہے وہ جشنِ مسرت جو بار بار آئے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ صرف ایک جگہ آیا ہے' اور وہ ہے وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰؑ کے جاں نثار حواریوں نے' آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ خدا سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے لئے ''مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ'' اتارے تاکہ اس سے ہماری جسمانی پرورش کے علاوہ ہمارے قلوب کو بھی اطمینان حاصل ہو۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ نے خدا سے درخواست کی کہ: رَبَّنَآ اَنۡزِلۡ عَلَيۡنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوۡنُ لَنَا عِيۡدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنۡكَ ۚ وَارۡزُقۡنَا وَاَنۡتَ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ ﴿۱۱۴﴾ (5:114)۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری نشوونما کا سامان ''آسمان'' سے عطا فرما تاکہ وہ رزق' اس جماعت کے السابقون الاولون کے لئے بھی موجبِ جشنِ مسرت ہو اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی۔۔ تو بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔'' سوال یہ ہے کہ یہ مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ آسمان سے اترنے والا رزق۔۔ کیا تھا جس کی درخواست خدا سے کی گئی تھی اور جو ان سب کے لئے باعثِ جشنِ مسرت تھا۔ اعجوبہ پسندوں نے تو حسب معمول' اسے بھی ایک چیستان بنا دیا اور کہا کہ حواریوں کے لئے آسمان سے پکے پکائے کھانے کا طشت اترا کرتا تھا حتیٰ کہ اس میں جو کھانے اترتے تھے ان کی تفاصیل تک بھی دینے لگ گئے۔ لیکن جن کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں' وہ جانتے ہیں کہ جماعت مومنین جب ''آسمان سے رزق'' طلب کرتی ہے تو اس سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔ ایک رزق وہ ہے جو انسانوں کے خودساختہ نظام کی رو سے ملتا ہے۔ یہ وہ رزق ہے جس سے جسم تو زندہ رہتا ہے لیکن شرفِ انسانیت کی موت واقع ہو جاتی ہے اور دوسرا رزق وہ ہے جس سے جسم انسانی کی نشوونما کے ساتھ' شرف وتکریم انسانیت کی بھی بالیدگی ہوتی ہے۔۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

ایں خدا نانے دہد جانے بُرد آں خدا نانے دہد جانے دہد

(مفہوم: یہ خدا (لوگوں کو) روٹی دیتے ہیں اور اس کے بدلے میں جان نکال لیتے ہیں۔ جبکہ وہ حقیقی خدا (قرآن کی

تعلیمات کے ذریعے) رزق، روٹی بھی دیتا ہے اور زندگی (کی خوشگواریاں بھی عطا کرتا ہے۔)

یہی وہ سماوی اقدار کے مطابق ملنے والا رزق تھا جس کے متعلق حواریوں نے کہا تھا کہ ''ان تاکل منھا و تطمئن قلوبنا'' وہ ہمارے لئے وجہ زیست بھی ہو اور باعثِ اطمینان قلب بھی۔ مومن کے لئے باعثِ مسرت وہی رزق ہوسکتا ہے جس سے اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو۔ اور ظاہر ہے کہ مومن کو اطمینان قلب اسی زندگی میں حاصل ہوسکتا ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق بسر ہو۔۔۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ (13:28)۔ یہی تھا وہ رزق جسے وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ (5:114)۔ کہا گیا تھا۔ یعنی خدا کے نظام ربوبیت کی صداقت کی نشانی اور اس کے خیر الرازقین ہونے کا ثبوت۔۔۔ یہ رزق انہیں ملا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یاد رکھو۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ (5:115)۔ جو اس نظام رزق سے انکار اور سرکشی کی روش اختیار کرے گا' جو اسے دوسروں سے چھپا کر رکھے گا' اس پر ایسا عذاب وارد ہوگا جس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

اس کفران کا نتیجہ:

یہی وہ عذاب ہے جسے سورۂ نحل میں ایک مثال کے ذریعے یوں سامنے لایا گیا ہے کہ:

خدا ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے۔ اس کے رہنے والوں کو امن بھی حاصل تھا اور اطمینان بھی۔ اس کی طرف چاروں طرف سے رزق فراوانیوں سے کھنچے چلا آتا تھا لیکن انہوں نے ان انعامات خداوندی سے کفر برتا اور نظام خداوندی کی جگہ اپنا خود ساختہ نظام اختیار کر لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ (16:112)۔

ایسینی فرقہ:

یہ انسانیت کی بڑی محرومی اور بدنصیبی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور انکے مقدس ساتھیوں کی اصلی تصویر یا تو ان کے نام لیواؤں کی عقیدت کی شمعوں کے دھوئیں سے ڈھپ چکی ہے اور یا اسے افسانہ طرازیوں کے پردوں میں چھپا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ حقیقت دنیا کے سامنے آ ہی نہیں سکی کہ وہ کیسے عظیم انقلاب کے پیامبر تھے اور انہوں نے کس طرح یہودی پیشوائیت کے خود ساختہ نظام ہیکل اور رومیوں کے قصرِ حکومت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا تھا۔ اگر ان کی صحیح تاریخ سامنے آ جاتی تو معلوم ہو جاتا کہ انہوں نے کس قسم کا آسمانی نظام معیشت قائم کیا تھا جس سے انہیں انسانوں کا مرہون منت ہوئے بغیر' سامان زیست میسر آتا اور ان کے لئے وجہ جشن عید بنتا تھا۔ لیکن وادیٔ قمران سے حال ہی میں جو دستاویزات برآمد ہوئی ہیں ان سے اس جماعت کے احوال وظروف پر خاصی روشنی پڑتی ہے جو اس زمانے میں ایسینی فرقہ کے نام سے معروف تھی اور جو حضرت یحییٰ کے زیر تربیت وقیادت پروان چڑھی تھی۔ خود حضرت عیسیٰؑ بھی' اپنے زمانۂ نبوت سے قبل اسی جماعت سے متعلق تھے۔ اس جماعت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان میں کوئی شے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی تھی۔ تمام سامانِ زیست مشترکہ استعمال کے لئے کھلا رکھا جاتا تھا۔ کسی کے پاس کوئی شے اس کی ضرورت سے فاضل نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد' آپ کے

متبعین کی جو جماعت بیت المقدس میں آ کر جمع ہوئی تھی خود اس کے متعلق بھی، موجودہ انجیل میں لکھا ہے کہ:

وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے اور اپنی جائداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (سب مل کر) خوشی اور سادہ دلی سے کھانا کھایا کرتے تھے اور خدا کی حمد کرتے اور سب لوگوں کو عزیز رکھتے تھے۔ (رسولوں کے اعمال۔ 27-2:21)

یہ تھا وہ نظامِ رزق جسے انہوں نے مائدۃ من السماء (سماوی اقدار کے مطابق رزق) کہہ کر پکارا تھا اور جس کے ملنے پر جشن عید منایا گیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی مخالفت:

اور یہ صرف حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں کی خصوصیت نہیں تھی۔ خدا کا ہر رسول اسی قسم کا انقلابی نظام قائم کرنے کے لئے آتا تھا جس میں ''تیری اور میری'' کا جھگڑا نہ رہے اور جو کچھ جماعت (یا امت) کے پاس ہو وہ سب کے لئے مشترکہ متاعِ زیست ہو۔ کیا آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی اس روایت پر غور نہیں کیا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ قبیلہ اشعر کے ہاں یہ دستور تھا کہ جنگ کے زمانے میں، یا ویسے ہی جب ضرورت کا تقاضا ہوتا، قبیلے کے تمام افراد، سارا سامان رزق ایک جگہ جمع کر لیتے اور اس میں سے ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لے لیتا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس اعتبار سے میں بھی قبیلہ اشعر میں سے ہوں۔ یہی تھا وہ آسمانی انقلاب جسے برپا کرنے کے لئے حضور ﷺ نے اپنی دعوت کو پیش کیا تھا۔ قریش کے تاجروں، مہاجنوں اور کعبہ کے مجاوروں کی طرف سے جو اس دعوت کی اس قدر شدید مخالفت ہوئی تھی تو اس لئے نہیں کہ اس میں ایک خدا کو الٰہ تسلیم کرنے کی تعلیم تھی۔ اس سے ان کا کیا بگڑتا تھا؟ یہ مخالفت اس لئے تھی کہ اس میں وحدت خالق کے ایمان کا فطری نتیجہ وحدت انسانیت کا نظریہ تھا۔ اس سے مساوات انسانیہ کا اصول سامنے آتا تھا جس کی رو سے، مختلف افراد میں کسی قسم کی تفریق باقی نہیں رہتی تھی۔ ''اللہ ایک ہے'' کے عقیدہ سے انہیں کسی قسم کی پرخاش نہیں تھی۔ انہیں مخاصمت تھی اس نظریہ سے کہ تمام انسان ایک جیسے ہیں اور ''تمام انسان ایک جیسے ہیں'' کے نظریہ کا اولین عملی نتیجہ یہ تھا کہ سامانِ زیست میں تمام افراد یکساں طور پر شریک ہیں۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کے سرچشموں پر اس طرح سانپ بن کر بیٹھ جائے کہ دوسرے انسان اپنی روٹی تک کے لئے اس کے دست نگر اور محتاج ہو جائیں۔ ابوجہل نے غلاف کعبہ کو تھام کر اپنے خداؤں سے جو فریاد کی تھی وہ یہی تھی کہ اس نئے دین لانے والے کی قیامت خیزیوں کو دیکھو کہ ؎

در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است — خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است

(مفہوم: اس کی نگاہ میں بالا اور پست، اونچا اور نیچ برابر ہیں۔ وہ اپنے غلام کے ساتھ ایک ہی دسترخواں پر، مل کر کھانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے۔ اس طرح کی مساوات اور بھائی چارہ عجمی ہیں۔ (عربی اصولوں کے خلاف ہیں) میں

خوب جانتا ہوں کہ یہ سلمان فارسیؓ ''مزدکی'' ہے)

مساواتِ انسانیہ کا اصول:

یہ تھا وہ نظام، جسے ہر رسول پیش کرتا تھا اور جس کی مخالفت اس کی قوم کے متمول طبقے کی طرف سے ہوتی تھی۔ قوم مدین نے حضرت شعیبؑ کی نماز (صلوٰۃ) کے خلاف اعتراض نہیں کیا تھا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ صلوٰۃ، انہیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنا مال بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ نظام خداوندی میں صلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہوتا ہے؟ یہ نظام، دولت پر اپنا کنٹرول اس لئے رکھتا ہے کہ اس سے مساوات انسانیہ قائم رہتی ہے۔ مساوات کے سلسلہ میں آپ غور کیجئے کہ محل میں پیدا ہونے والا اور جھونپڑی میں جنم لینے والا، دونوں، ایک جیسی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔ محل میں پیدا ہونے والا بچہ نہ اپنی پیٹھ پر سونے اور چاندی کی تھیلیاں لاد کر لاتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں کوئی خداوندی دستاویز ہوتی ہے کہ ہم نے اسے اتنے مربعے اراضی یا اتنے کارخانوں کا مالک بنا دیا ہے۔ دونوں بچے خالی ہاتھ پیدا ہوتے ہیں۔ پھر دونوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی یکساں ہوتی ہیں۔ یعنی جن اشیاء پر ان کی زندگی کا مدار ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ ہے مساوات انسانیہ کی بنیاد۔ لیکن انسانوں کا خودساختہ غلط نظام، ان میں تفریق پیدا کر دیتا ہے۔۔ ایسی تفریق کہ ایک انسان کے بچوں کو اتنا بھی میسر نہیں جتنا دوسرے انسان کے کتوں کو ملتا ہے۔ دین خداوندی اس تفریق کو مٹا کر، مساوات انسانیہ قائم کرنے کے لئے آتا ہے اور خدا کا رسول اس نظام کو عملاً متشکل کر کے دکھاتا ہے۔

روٹی کی اہمیت:

اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کا مدار صرف ''روٹی'' (بنیادی ضروریات زندگی) پر نہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ارتقائے حیات کی موجودہ سطح پر، انسان کی طبیعی زندگی کا مدار روٹی ہی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظام خداوندی میں روٹی کو اس قدر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جب دنیا میں خدا کے پہلے گھر کی بنیاد رکھتے ہیں۔۔۔ یعنی توحید کا اولین مرکز قائم کرتے ہیں۔۔۔ تو اس کے بعد سب سے پہلی آرزو جو دعا بن کر ان کے لبوں تک آتی ہے، یہی ہے کہ: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (2:126)۔ اے میرے نشوونما دینے والے! تو اس بستی کو پرامن بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو ہر طرح کا رزق مہیا کر دے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں، رزق فراواں کو خدا کا انعام، اور بھوک کا اس کا عذاب قرار دیا گیا ہے۔ اس نے بنی آدم سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔۔ (20:124) جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (20:124) اور جس کی یہاں روزی تنگ ہوگی اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا کہ لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ (7:40)۔ ان پر آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ یہی تھا خدائے جلیل کا وہ اعلان عظیم جس کی تشریح میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی اس طرح صبح

کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' خدا نے اس بستی سے اپنی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا۔'' یہ کیا ہے؟ وہ عدم مساوات انسانیہ جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ اگر اس بستی پر کوئی آفت آ گئی تھی (اور ایسا بعض اوقات ہنگامی حالات میں ہو جاتا ہے) تو اس کے تمام باشندوں کو بھوکا رہنا چاہئے تھا لیکن ایسا نظام جس میں بستی کے چند افراد تو پیٹ بھر کر کھا لیں لیکن دیگر افراد بھوکے رات کاٹیں' یہ اسلامی نظام نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے اس بستی پر سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔ خدا تو اس نظام کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے جو اس کے قوانین کے مطابق متشکل ہو۔ وہ نظریہ زندگی' وہ نظام حیات' وہ تہذیب' وہ تمدن کبھی باقی نہیں رہ سکتا جس میں انسان اور انسان میں فرق کیا جائے' جس میں طبقاتی تقسیم ہو۔ فلاح اور بقا اسی نظریہ' اسی نظام' اسی تمدن کے لئے ہے جو بلا تفریق تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں باعث منفعت ہو۔ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ط (13:17)۔ حقیقت یہ ہے کہ بھوکے آدمی کے لئے تمدنی ترقی کا کوئی شعبہ بھی وجہِ کشش اور باعث طمانیت و تسکین نہیں ہو سکتا۔ کسی بھوکے آدمی کو جناح باغ لے جا کر بہار کی رنگینیاں اور کیف آفرینیاں دکھایئے' وہ انہیں کبھی (Appreciate) نہیں کر سکے گا۔ اسے بتایئے کہ ملک میں بجلی اس قدر عام ہو گئی ہے کہ گھر گھر قمقمے جل رہے ہیں۔ سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے۔ سر بفلک عمارات کھڑی ہو گئی ہیں۔ بڑے بڑے گرانڈیل کارخانے مصروفِ گردش ہیں۔ فضا میں طیارے پرفشاں ہیں۔ زمین پر موٹریں سبک خرام ہیں۔ وہ یہ سن کر کہے گا کہ یہ سب ٹھیک ہے لیکن۔۔ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی۔۔ بھوک میں بہار کی نزہت آفرینیوں اور بجلی کے قمقموں کی نور افشانیوں سے لطف اندوز ہونا تو ایک طرف' سعدی کے الفاظ میں' بھوکے کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ رات کو نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس سوچ میں غرق ہوتا ہے کہ۔۔ چہ خورد بامداد فرزندم۔۔ صبح میرے بچوں کو روٹی کہاں سے ملے گی۔۔ اس سے بھی آگے بڑھئے جاہلیہ عرب میں قبیلہ بنو حنفیہ نے آٹے کا ایک بت بنا رکھا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ لیکن جب قحط پڑا تو وہ اپنے اس خدا کو بھی کھا گئے۔ اور ایک قبیلہ بنو حنفیہ ہی پر کیا منحصر ہے' ہر بھوکا اس خدا کو کھا جاتا ہے جو اسے روٹی نہیں دیتا۔ روس کے انقلابیوں نے اسی طرح اس خدا کو کھا لیا تھا جس کے متعلق انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کی مفلسی اور مفلوک الحالی کا ذمہ دار وہی ہے۔۔ لہٰذا جس شخص کے پیٹ میں روٹی نہیں' جس کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں' جسے سر چھپانے کے لئے چھت میسر نہیں' جس کے پاس دم توڑنے والے بچے کے حلق میں ٹپکانے کے لئے دودھ کے چار قطرے نہیں' اس کے لئے دنیا کی کوئی جاذبیت وجہِ سکون اور باعث دلکشی نہیں ہو سکتی۔ جس شخص کے پاس اپنے بچے کے داخلہ کے لئے پیسے نہیں' اس کے لئے یہ خوش خبری کس طرح وجہِ طمانیت ہو سکتی ہے کہ ملک میں دس ہزار اسکول کھل گئے ہیں اور دو ہزار کالج قائم ہو گئے ہیں۔۔ قوم کی ترقی کا معیار ایک اور فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اسمیں ہر ایک فرد کو کیا میسر آتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں چند انسانوں کو کیا کچھ حاصل ہو گیا ہے اور حاصل ہو رہا ہے۔۔ جنت کی تو بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں جس قدر سامان آسائش و آرائش ہے' ہر ایک کے لئے یکساں ہے۔ جس جنت میں مساوات انسانیہ نہیں' وہ جنت نہیں جہنم ہے۔

صرف خدا کی ملکیت:

لیکن اس قسم کی عملی مساوات انسانیہ تو اسی صورت میں قائم ہوسکتی ہے جب رزق کے سرچشمے خدا کی ملکیت میں رہیں' افراد کی ملکیت میں نہ چلے جائیں۔ جنت کے متعلق یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس کی زمین' اس کے چشمے' اس کی نہریں' اس کے باغات' افراد کی ملکیت ہوں گے کہ جس کا جی چاہے اپنے قطعہ اراضی کو پٹہ پر دیدے اور جس کا جی چاہے' اسے گرو رکھ دے یا فروخت کردے۔ توحید کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ سارے سلسلۂ کائنات کا واحد مالک خدا ہے۔ اگر اس کی ملکیت میں کسی اور کو شامل کرلیا جائے تو یہ شرک ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن انداداً من دون اللہ کہہ کر پکارتا ہے (2:22)۔ جب رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت تسلیم کرلی جائے تو جن لوگوں کی اپنی ملکیت نہ ہو' وہ ان مالکوں کے محتاج اور دست نگر ہوجاتے ہیں اور محتاجی کا اگلا قدم۔۔ یا یوں کہئے کہ فطری نتیجہ۔۔ محکومی ہے۔ قرآن' اس تصور کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو جب وہ کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لَکُمۡ رِزۡقًا۔ تم خدا کو چھوڑ کر جن کی محکومی اختیار کرتے ہو' جن کے تابع فرمان رہتے ہو' وہ وسائل رزق کے مالک نہیں۔ اس لئے تم فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ الرِّزۡقَ ۔۔ رزق' خدا کے ہاں سے طلب کو۔ وَاعۡبُدُوۡہُ۔ اس طرح محکومی صرف اسی کی باقی رہ جائے گی۔ وَاشۡکُرُوۡا لَہٗ ؕ (29:17)۔ اور سپاس گزاری بھی اسی کی زیبا ہوگی۔ تم اپنے غلط نظام معیشت کی وجہ سے' دوسرے انسانوں کو ذرائع رزق کا مالک بنا دیتے ہو۔ پھر تم ان کے محتاج و محکوم بھی ہوجاتے ہو اور رہین منت اور سپاس گزار بھی۔ اس طرح تم اپنی شرف انسانیت کو بیچ کر' اپنے بدن کو زندہ رکھتے ہو۔ قرآن' اس طرح سے حاصل کردہ رزق کو حلال وطیب قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ: فَکُلُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪ وَّاشۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۱۱۴﴾ (16:114)۔ اگر تم انسانوں کی محکومی کے چنگل سے آزاد ہوکر صرف خدا کی محکومی اختیار کرنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم رزق صرف خدا کے ہاں سے حاصل کرو اور اس طرح شکر گزار بھی اسی کے بنو۔ یہی وہ رزق ہے جسے حلال وطیب کہا جائے گا۔ یعنی مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ ۔ وہ رزق جو تمہیں خدا کے ہاں سے ملے جس میں کسی انسان کی ملکیت کا دخل نہ ہو۔ یہی تھا وہ حلال وطیب رزق جس کے لئے حضرت عیسیٰ ؑ کے حواریوں نے درخواست کی تھی اور جس کے حصول کے بعد جشن عید منایا گیا تھا اور یہی تھا وہ رزق طیب جو اس رسول ﷺ آخرالزمان کے متشکل کردہ نظام کی وساطت سے حاصل ہوا تھا جس کی بعثت عظمیٰ کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَیُحِلُّ لَہُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیۡہِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنۡہُمۡ اِصۡرَہُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ (7:157) وہ نوع انسان کے لئے رزق طیب کو حلال قرار دے گا اور رزق خبیث کو حرام ٹھہرائے گا اور اس طرح ان اغلال و سلاسل کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑے چلی آرہی تھی اور محتاجی ومحکومی کی استخواں شکن سلوں کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ جو رزق نظام خداوندی کے تابع ملتا ہے' اسے قرآن نے ہر جگہ ''رزق کریم'' کہہ کر کیوں تعبیر کیا ہے؟ اس لئے کہ رزق تو انسانوں کے خودساختہ نظام کی رو سے بھی مل ہی جاتا ہے' لیکن وہ رزق ملتا ہے عزت اور توقیر بیچ کر۔ لیکن

خدا کی طرف سے جو رزق ملتا ہے اس میں تکریم و احترام انسانیت بھی باقی رہتی ہے۔ اسی لئے یہ رزق ''رزق کریم'' ہوتا ہے۔

انسانیت کش نظام:

دین خداوندی کا مقصد ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشوونما پا کر پروان چڑھ جائیں اور اس طرح وہ زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ یہ صلاحیتیں اسی صورت میں برومند ہو سکتی ہیں جب وہ سامان زیست کے لئے کسی انسان کا دست نگر نہ ہو۔ رزق کو اپنے ہاتھ میں لے لینے والی قوتیں اتنا ہی نہیں کرتیں کہ وہ لوگوں کو مفلس اور محتاج بنا دیتی ہیں۔ وہ ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتیں۔ اس لئے کہ انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے تابع فرمان کام کرنے والوں کی صلاحیتیں نشوونما پا گئیں تو وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جائیں گے اور انہیں حیوانات کی طرح دبا کر رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف حیوانی سطح پر زندہ رہیں' انسانی سطح پر کبھی نہ آ سکیں۔ آپ سوچئے کہ جب انسانوں کی اکثریت کو اس طرح ابھرنے اور آگے بڑھنے سے روک دیا جائے تو یہ چیز ارتقائے انسانیت کے راستے میں کس قدر سنگ گراں بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اکتناز دولت کرنے والے سرمایہ داروں اور ان کے شریک کار مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہا ہے کہ وہ کاروان انسانیت کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انہیں خدا کی طرف جانے ہی نہیں دیتے۔ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (9:34)۔

رسول ﷺ کے بعد:

قرآن بتاتا ہے (اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ) خدا کا رسول اس قسم کا انقلابی نظام متشکل کر کے چلا جاتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد' مفاد پرست گروہ پھر سے سر نکالتا اور اس نظام کو الٹنے کی کوشش کرتا لیکن وہ تنہا ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے مذہبی پیشوائیت کو اپنے ساتھ ملاتا۔ یہ مذہبی پیشوا اس سلسلہ میں کیا ٹیکنیک اختیار کرتے' اسے قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کے ضمن میں بڑے بصیرت افروز انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کے معاشرہ کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ انکے ہاں کے بڑے بڑے لوگ (جو دولت اور قوت کے مالک بن بیٹھے تھے) کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے اور جب انہیں دشمن پکڑ کر لے جاتا تو پھر چندہ اکٹھا کرتے تا کہ ان کا فدیہ دے کر انہیں دشمن کی قید سے آزاد کرا لیا جائے۔ وہ (انہیں اس طرح آزاد کرانے کو) بڑا ثواب کا کام سمجھتے۔ اگر مذہب پرستی کی سطحی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ کام واقعی بڑے ثواب کا نظر آئے گا۔۔۔ خود قرآن کریم میں' اسیروں اور غلاموں کو آزاد کرانے کے کام کو بڑا مستحسن قرار دیا گیا ہے۔۔ لیکن قرآن اس قسم کے نظر فریب سطحی جذبات سے بلند ہو کر حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ اس نے اس مقام پر کہا کہ اس طرح قیدیوں کا فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو ثواب کا کام سمجھنے والو! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ: وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرنا' ایسا سنگین جرم تھا جس کی تلافی اس قسم کے خیرات کے کاموں سے نہیں ہو سکتی۔ تمہیں جو ضابطۂ ہدایت دیا گیا تھا اس میں دو احکام تھے۔۔ ایک یہ کہ اپنے ہاں کبھی ایسی صورت پیدا نہ کرو کہ تم میں سے کمزور

لوگوں کو دشمن اچک کر لے جائیں اور دوسرے یہ کہ جن کمزور و ناتواں لوگوں کو مستبد قوتیں قیدی بنالیں انہیں فدیہ دے کر چھڑا دیا کرو۔ یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔ تم نے پہلے حکم کو نہ صرف پس پشت ڈال دیا بلکہ عمداً اس کی خلاف ورزی کی اور دوسرے حکم کی تعمیل سے اپنے آپ کو بڑا نیکوکار سمجھنے لگ گئے۔ یہ روش غلط ہے۔ ضابطہ خداوندی کو بتمامہٖ لیا جائے گا تو اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب ہوگا۔ لیکن اگر ایسا کیا جائے کہ: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ اس کے ایک حصہ پر ایمان رکھا جائے اور دوسرے حصہ سے انکار کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نہیں برآمد ہوگا کہ تمہیں پچاس فیصد نمبر مل جائیں گے۔ بالکل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ (2:85) تم دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہوگے اور قیامت کے دن بھی سخت ترین عذاب میں گرفتار۔

مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ نظام خداوندی کے اس حصہ کو جس سے مفاد پرستوں کی منفعت کوشیوں پر زد پڑتی ہو، پس پشت ڈال دیتی ہے اور ظواہر و رسوم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت دیتی ہے کہ وہ عین دین بن جاتی ہیں۔ یہ ہے ان کی وہ ٹیکنیک جس سے وہ قوم کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ دین خداوندی پر عامل ہے۔

جس طرح سابقہ امتوں کے احبار و رہبان نے یہ چال چلی تھی، اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ ان کے ہاں بھی دین کی اصل و اساس کو پس پشت ڈال دیا گیا اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بڑھا بڑھا کر عین دین بنا دیا گیا۔ اب سارا زور ان جزئیات کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ دین کی اصل و بنیاد کو سامنے نہ آنے دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کچھ روایات اور حکایات وضع کی جاتی ہیں جنہیں کبھی حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور کبھی سلف صالحین کی طرف۔ چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

(1) قرآن کریم میں ہے:

دولت جمع کرنے کے خلاف:

اے ایمان والو! یاد رکھو۔ ان علماء و مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو لوگوں کے مال کو ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور اس طرح انہیں خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔

(اور اسے بھی یاد رکھو کہ) جو لوگ دولت جمع کرتے ہیں اور اسے نوع انسانی کی منفعت کے لئے (فی سبیل اللہ) کھلا نہیں رکھتے، ان کے لئے الم انگیز عذاب ہے۔ جس دن چاندی سونے کے ان سکوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں، ان کے پہلوؤں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ اب اس اکتناز کا مزہ چکھو۔ (9:34-35)

ان آیات سے روز روشن کی طرح واضح ہے (اور قرآن میں اس مضمون کی یہی دو آیات نہیں۔ اس قسم کی متعدد آیات ہیں) کہ اسلام ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں دولت جمع نہیں کی جا سکتی۔ اب دیکھئے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے

خلاف کیا کیا۔اس نے ایک روایت وضع کی جو غور سے سننے کے قابل ہے۔وہ روایت یہ ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب (مندرجہ بالا) آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔پس عمرؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبی ﷺ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گذری ہے۔آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔الخ

(ابوداؤد، بحوالہ مشکوٰۃ، جلد اوّل، اردو ترجمہ ص:309)

آپ غور فرمائیے کہ اس ایک روایت نے کس طرح اسلام کے پورے کے پورے معاشی نظام کو الٹ کر رکھ دیا۔اس روایت سے (جو ظاہر ہے کہ وضعی ہے) یہ ثابت ہوا کہ۔

(1) صحابہؓ سب کے سب سرمایہ دار تھے اور دولت جمع کرنا ان کا شعار تھا۔

(2) صحابہؓ کی (معاذ اللہ) کیفیت یہ تھی کہ خدا ایک حکم نازل کرتا ہے۔اس کا رسول اس حکم کو ان تک پہنچاتا ہے۔لیکن وہ حکم ان پر سخت گراں گزرتا ہے۔وہ اسے بدلوانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے (معاذ اللہ) ان سرمایہ پرستوں کا سب سے بڑا نمائندہ حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ کے پاس جاتا ہے۔

(3) رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ) یہ فرماتے ہیں کہ تم خدا کے اس حکم کا کچھ خیال نہ کرو۔تم جتنی جی چاہے دولت جمع کرتے جاؤ۔بس اس میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ نکال دیا کرو۔باقی دولت سب پاک ہو جائے گی۔(واضح رہے کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا حکم بھی قرآن میں کہیں نہیں)۔

آپ دیکھیں گے کہ اس اڑھائی فیصد زکوٰۃ کی اہمیت اور افضلیت پر اس قدر زور دیا جائے گا اور قرآن کی اس آیت کے متعلق (جس میں دولت جمع کرنے کے خلاف اس قدر تہدید آئی ہے) ایک لفظ بھی نہیں کہا جائے گا۔آپ نے غور فرمایا کہ اس ٹیکنیک سے مسلمانوں کو کس طرح اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ دولت جمع کرنا کوئی جرم نہیں اور زکوٰۃ دیدینے سے سب مال پاک ہو جاتا ہے!

عبوری دور کے احکام:

ایک مثال اور لیجئے۔قرآن کریم کا نصب العین ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل تھا جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ہر فرد کو اس کی ضروریات زندگی، بطور بنیادی حق انسانیت ملتی رہیں۔آغاز اسلام کے وقت معاشرہ جس حالت میں تھا اس نے اپنے پروگرام کو وہاں سے شروع کر کے، بتدریج اس کے منتہیٰ تک لے جانا تھا۔ظاہر ہے کہ اس وقت معاشرہ میں طبقاتی تفاوت

موجود تھا۔۔ کچھ لوگ امیر تھے، کچھ غریب اور محتاج۔۔ اس عبوری دور کے لئے قرآن نے دولت مندوں کو تلقین و تاکید کی کہ وہ صدقہ و خیرات سے محتاجوں کی مدد کریں۔ وراثت کے احکام بھی بنیادی طور پر اسی دور سے متعلق تھے۔ اس نظام کی آخری شکل یہ تھی جس کے متعلق قرآن میں ہے کہ: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219)۔ اے رسول ﷺ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی بنیادی ضروریات سے زائد ہے، سب کا سب۔ یہ نظام ایسا تھا جس میں ہر ایک کی ضروریات نظام مملکت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں اور کسی کے پاس فالتو روپیہ رہتا ہی نہیں تھا۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے بعد کیا کیا؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی طرف سے صدقہ، خیرات، فطرانہ کے لئے صبح و شام، دن رات، ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور قرآن کی وہ آیت جس میں حکم دیا گیا تھا کہ فالتو دولت کسی فرد کے پاس نہ رہنے پائے، کبھی سامنے نہیں لائی جاتی! جب اس پر زور دیجئے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ آیت، زکوٰۃ کے حکم سے منسوخ ہو چکی ہے۔ (بحوالہ روایت حضرت ابن عباسؓ)

صدقہ و خیرات کا نتیجہ:

اور آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ صدقہ اور خیرات کا عملی مفہوم کیا ہے؟ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ نظام معاشرہ ایسا قائم کیا جائے جس میں ایک طبقہ ہمیشہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم، فلہٰذا، دوسروں کا محتاج رہے اور دوسرا طبقہ ایسا ہو جس کے پاس اپنی ضروریات سے زائد دولت ہو۔ یہ دوسرا طبقہ، پہلے طبقہ کو خیرات دے کر ثواب کمائے۔ آپ سوچئے کہ اس دوسرے طبقہ کے پاس یہ فالتو روپیہ آیا کہاں سے ہے؟ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ یہ روپیہ انہی لوگوں کی محنت کی کمائی ہے، جو معاشرہ میں محتاج بن چکے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو ان کی محنت کا پورا پورا ماحصل دے دیا جاتا تو نہ وہ محتاج ہوتے، نہ ان کے پاس فالتو روپیہ آتا۔ لیکن اس نظام نے کیا یہ کہ پہلے ایک طبقہ نے محنت کشوں کی کمائی کو غصب کیا اور اس طرح خود دولت مند بن گیا اور محنت کشوں کو محتاج بنا دیا۔ اور پھر ان محتاجوں کو خیرات کے چند ٹکے دے کر، جنت کا مالک بن بیٹھا۔ حالانکہ، قرآن کے الفاظ میں، ان لوگوں کو محتاج بنانا ایسا سنگین جرم ہے جس کی تلافی صدقہ، اور خیرات سے ہو ہی نہیں سکتی۔ خیرات دینے والے کا نفس موٹا ہو جاتا ہے اور لینے والے کے شرفِ انسانیت کی سخت تذلیل ہوتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق۔

الصدقۃ نمیت القلب (خیرات سے انسان کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔)

قرآن کریم نے عبوری دور کے لئے (اسلامی نظام کی تشکیل کے زمانے تک بہ تقاضائے حالات) اسے روا رکھا تھا۔ اور اس میں بھی دینے والوں سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اس جذبہ کے ماتحت دیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76:9)۔ ہم تم سے کسی معاوضہ کے متمنی ہیں نہ شکریہ کے خواہاں۔ اور اس کی تاکید کر دی تھی کہ وہ محتاج کی امداد کے بعد اسے احسان جتا کر اپنے صدقات کو باطل نہ بنا دیں لیکن موجودہ مذہب نے صدقہ و خیرات کو مستقل کار ثواب قرار دے کر، قوم میں

محتاجوں اور مفلسوں کے گروہ کی موجودگی کو مستقلاً ضروری قرار دے دیا تا کہ ثواب دارین حاصل کیا جائے۔ کیا یہ وہی بنی اسرائیل کی روش نہیں جس سے وہ پہلے اپنے ہم نفسوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے تھے اور پھر فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو بہت بڑی نیکی کا کام تصور کرتے تھے؟ یاد رکھئے! جس نظام معاشرہ میں محتاج اور مفلس مستقلاً موجود رہیں اس سے زیادہ انسانیت سوز نظام کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

نظامِ ربوٰ:

ایک مثال اور سامنے لائیے۔ قرآنی تصور معیشت کی رو سے' کوئی شخص جو کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کو کلیتہً یا جزء ہتیا کر لے جائے' وہ چور ہے' ڈاکو ہے' رہزن ہے' فریب کار ہے۔ قرآن ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کوئی کسی کی محنت کو غصب کر کے نہیں لے جا سکتا۔ اس کی بالکل ضد ایک اور نظام معیشت ہے جس میں ایک شخص محض سرمایہ کے زور پر دوسروں کی محنت کو غصب کر لیتا ہے۔ وہ اسے ربوٰ کے نظام سے تعبیر کرتا ہے۔۔ ربوٰ کے معنی ہیں بڑھوتری۔ یعنی اپنے سرمایہ سے زیادہ وصول کرنا۔ یہ نظام اس قدر قرآنی نظام کی ضد اور اس کا دشمن ہے کہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ (2:279)۔ انہیں خدا اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا الٹی میٹم دے دو۔ آپ نے غور کیا کہ اسلامی نظام کی رو سے ربوٰ کیسا سنگین ترین جرم ہے۔ یہ بغاوت کے مرادف ہے۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے کیا کیا۔ وہ ربوٰ کو جائز تو قرار نہیں دے سکتی تھی لیکن اس نے ربوٰ کی تعریف (Definition) ایسی کر دی جس میں دوسروں کی محنت کا غصب کر کے لے جانا شیر مادر کی طرح حلال وطیب قرار پا گیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ایک شخص کسی کو کچھ روپیہ قرض دے تو اس اصل زر سے کچھ زیادہ وصول کرنا ربوٰ ہے اور بس۔ یعنی زمیندار کا' کاشتکار کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے پیدا کردہ فصل کا آدھا سمیٹ لینا ربوٰ نہیں۔ صاحب جائداد کا مکانوں کا کرایہ وصول کرنا ربوٰ نہیں۔ ایک کارخانہ دار کا ہزارہا مزدوروں کی محنت کے ماحصل میں سے انہیں تین چار روپیہ روزانہ دے کر باقی سارا غصب کر لینا ربوٰ نہیں۔ دکاندار کا' کاریگر کو کم از کم اجرت دے کر' باقی سارا منافع ہڑپ کر جانا' ربوٰ نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ مذہبی پیشوائیت نے ربوٰ کی غلط (Definition) سے' (ایک مختصر سی شکل کو چھوڑ کر) ربوٰ کے سارے کاروبار کو کس طرح حلال وطیب قرار دے دیا۔

تجارت کا منافع:

اسی سلسلہ میں' ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ قرآن کریم نے لاگت پر کچھ زیادہ وصول کر لینے کو تجارت قرار دے کر' اس منافع کو جائز قرار دیا تھا۔ یہ درحقیقت' اس چیز کے فروخت کرنے والے کی محنت کا معاوضہ تھا۔ قدیم زمانہ میں تجارت جان جوکھوں کا کام ہوتا تھا۔ جو قافلہ ترکستان سے سامان لاد کر' پہاڑوں' دریاؤں' صحراؤں' جنگلوں' پرخطر راستوں' برفانی چوٹیوں کو عبور کرتا ہوا' مہینوں کے بعد ہندوستان پہنچتا تھا' وہ جو کچھ اپنے مال پر زائد وصول کرتا تھا' وہ اس کی محنت کا معاوضہ تھا۔ اسے قرآن نے ربوٰ کی حد سے خارج قرار دیا تھا۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ ایک شخص' ایک کمرہ میں میز کے سامنے بیٹھا ٹیلیفون پر سودے پر

سودے کرتا چلا جاتا ہے۔ نہ حقیقتاً کچھ خریدتا ہے نہ بیچتا اور اس طرح شام کو ہزاروں روپے اس کے بینک میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اسے تجارت قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہزاروں روپے کہاں سے آتے ہیں؟ ان اشیاء کے صارفین کی جیب سے۔ کیا یہ صارفین کی گاڑھے پسینے کی کمائی کو غصب کر لینے کے مرادف' فلہٰذا ربوٰ نہیں؟ لیکن مذہبی پیشوائیت کا نظام اسے ربوٰ قرار نہیں دیتا۔۔ وہ' دوسروں کی محنت غصب کر لینے کے ان تمام طریقوں کو حلال وطیب قرار دیتا ہے اور اس سے جب محنت کش یا صارفین غریب ہو جاتے ہیں' تو ان زمینداروں' کارخانہ داروں' اور اس قسم کے منافع خور سوداگروں سے اپیل کرتا ہے کہ ان غریبوں کو خدا واسطے کچھ دے کر' اپنا گھر جنت میں الاٹ کرالیں یا حج کر کے اپنے سب گناہ بخشوالیں۔ حالانکہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط (2:85) ان محنت کشوں کی محنت کو غصب کر کے اپنی تجوریاں بھرتے چلے جانا ایسا سنگین جرم تھا جسے خدا اور رسول ﷺ کے خلاف بغاوت قرار دیا گیا تھا۔۔ غلط نظام کی عدالت' چور' ڈاکو' رہزن کو مجرم قرار دے کر مستوجب سزا ٹھہرائے گی لیکن اس قسم کے رہزنوں' اور قزاقوں کو کسی جرم کا مرتکب قرار نہیں دے گی۔ علمائے کرام' روپیہ کا سودی کاروبار کرنے والے کو جہنم کا کندہ بنائیں گے' لیکن ربوٰ کی ان دوسری شکلوں میں' سر سے پاؤں تک ڈوبے رہنے والوں کو پکے اور سچے مومن قرار دیں گے۔۔ ہے ناں یہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (2:85) کی بین مثال!

بھوکے کا جرم:

اس کے برعکس' اگر کسی مزدور کو مسلسل کوشش کے باوجود روزگار نہ ملے اور بھوک سے تنگ آ کر کہیں سے روٹی چرا لے تو قانون اسے جیل خانے بھیج دیتا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ بھی ہماری تاریخ میں موجود ہے کہ جب ایک شخص کے ملازموں (غلاموں) نے بھوک سے تنگ آ کر غلہ چرایا تھا' تو حضرت عمرؓ نے انہیں سزا نہیں دی تھی۔ سزا ان کے مالک کو دی تھی' یہ کہہ کر کہ اگر تم انہیں بھوکا نہ رکھتے تو یہ چوری کرنے پر مجبور کیوں ہوتے۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ درحقیقت قرآن کریم کے اس نظریہ پر مبنی ہے کہ اضطراری حالت میں بقدر ضرورت حرام شے کا کھا لینا بھی جائز ہے۔ امام ابن حزم نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

فقہا کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص پیاسا ہے اور اس کی وجہ سے اسے موت کا خطرہ لاحق ہو رہا ہے تو اس کے لئے فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی پانی پائے' لے لے۔ خواہ اس کے لئے اسے جنگ تک بھی کیوں نہ کرنی پڑے۔

اس پر اضافہ کرتے ہوئے امام صاحب فرماتے ہیں کہ:

اگر پیاس کی وجہ سے موت کی مدافعت کے لئے پانی حاصل کرنے کی خاطر جنگ کرنے کی اجازت ہے تو کیا وجہ ہے کہ بھوک اور عریانی کی وجہ سے حفاظت جان کے لئے جنگ کرنے کی اجازت نہ ہو۔ ان دونوں میں فرق کرنا قرآن' سنت' اجماع اور فقہی قانون قیاس کے خلاف ہے۔

اس کے بعد امام ابن حزم کہتے ہیں کہ:

اگر اس مقابلہ میں یہ مجبور شخص مارا جائے تو فریق مخالف کے ذمے اس کی دیت لازم آ جائے گی۔ لیکن اگر وہ شخص مارا

جائے جو اس کے حق کو روک رہا تھا تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ کیونکہ اس نے اس کا حق روکا تھا۔ (المحلیٰ، جلد:6)

معاشرہ میں اس قسم کی صورت حالات کے پیدا ہونے کو روکنے کے لئے حضور نبی اکرم ﷺ نے وہ نسخہ تجویز فرمایا تھا جسے آپ نے تمثیلی انداز میں یوں بیان فرمایا تھا کہ:

کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی لے لیں گے۔ اب اگر ان نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں پانی دے کر روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی۔۔ باب الفتن)

آپ دیکھئے، کہ حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر اوپر والے پانی نہیں دیتے تو نیچے والوں کو چاہئے کہ صبر شکر کر کے بیٹھ جائیں اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔ حضور ﷺ ایسا فرما ہی نہیں سکتے تھی کوئی ایسا شخص اس قسم کی بات نہیں کہے گا جسے معلوم ہو کہ جان کی حفاظت، ہر جاندار کی زندگی کا بنیادی تقاضا ہے۔ اس تقاضا کو روکا نہیں جا سکتا۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ حقائق سے چشم پوشی کرتا ہے۔ اسی تقاضا کا اعتراف تھا جس کے لئے خدا نے بھوک سے مجبور و مضطر کے لئے حرام کھا لینے کی اجازت دی تھی۔ قرآن کریم کے اسی حقیقت بدوش فیصلہ کی تعمیل تھی جس کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرنے والوں کو سزا نہیں دی تھی۔ اسی قرآنی فیصلہ کی عملی تشریح تھی جس کے لئے امام ابن حزم نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ بھوکے، پیاسے، ننگے کو ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے جنگ تک بھی کرنی پڑے تو اسے معذور سمجھا جائے گا۔۔۔ اور اسی صورت حال کو روکنے کے لئے حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ کشتی اسی صورت میں سلامت رہ سکتی ہے جب تمام اہل کشتی کو ضرورت کے مطابق پانی ملتا رہے۔

یہ تھا خدا کا فیصلہ اور یہ تھی اس فیصلے کی عملی تشریح جو اس کے رسول ﷺ نے بیان فرمائی۔ لیکن اب یہ فیصلہ سمٹ سمٹا کر صرف اتنا رہ گیا کہ بھوکے کے لئے، اضطراری حالت میں سؤر کا گوشت کھانا جائز ہے۔۔ یعنی جس بھوکے کے پاس روٹی کھانے کے لئے چار آنے کے پیسے نہیں، وہ کہیں سے تلاش کر کے، دس روپے کا لحم خنزیر حاصل کرے تو اس سے اپنی بھوک مٹا سکتا ہے۔۔ آپ نے دیکھا کہ اس فتویٰ کی رو سے کس طرح قرآن کا حکم بھی (بظاہر) اپنے مقام پر باقی رہا اور ''کشتی'' کے اوپر کے حصے والے'' بھی دندناتے پھرتے رہے! لیکن اس قسم کی خود فریبی یا ابلہ فریبی سے حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق، کشتی تو سلامت نہیں رہ سکتی۔

ظواہر پرستی:

دین کے نظام میں، نماز، روزہ، حج وغیرہ وہ ذرائع تھے جن سے دین کا مقصود حاصل ہونا تھا۔ یعنی مساواتِ انسانیہ اور

احترامِ آدمیت کا مقصدِ عظیم۔ لیکن مذہب میں یہی چیزیں مقصود بالذات بن گئیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اب زور نماز، روزہ وغیرہ کی ظاہر اور رسمی ہیئت کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور اس مقصد کو سامنے لایا ہی نہیں جاتا جس کے حصول کا یہ ذریعہ تھے۔ اس کے برعکس، قرآن کو دیکھئے تو وہ سارا زور مقصد پر دیتا ہے۔ غور سے سنئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی کی راہ اس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر، اس کے قانون مکافاتِ عمل کے لئے حیات آخرت پر، ملائکہ پر، ضابطہ خداوندی پر اور ان انبیاء پر جن کی وساطت سے یہ ضوابط خداوندی دنیا کو ملے۔ ان امور پر ایمان لائے اور پھر مال کی محبت کے باوجود اسے ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے جو اس کے قرب و جوار میں (یا رشتہ داروں میں) محتاج ہوں۔ جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہوں۔ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو، یا ان میں کام کرنے کی استطاعت نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جن کے پاس زادِ راہ نہ رہے، یا وہ جن کی کمائی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہ ہو۔ یا جو لوگ دوسروں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں۔ انہیں آزاد کرانے کے لئے اپنی فاضلہ دولت کو وقف کر دیں۔ نیکی کی راہ ان لوگوں کی ہے۔۔ الخ (2:177)

ایمان کی اہمیت:

اس مقام پر میں، ایک ثانیہ کے لئے رک کر، ایک اہم نکتہ کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس آیہ جلیلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اصل نیکی کا کام یہ ہے کہ تم دوسروں کی مدد کے لئے اپنا مال کھلا رکھو۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اہم شرط بھی عائد کر دی ہے اور وہ یہ کہ تم دین کے ان اساسی عناصر پر ایمان لاؤ۔ سوال یہ ہے کہ ایمان کی کیا اہمیت ہے اور اس کے بغیر خود مال کا دینا بھی نیکی کا کام کیوں نہیں قرار پاتا۔ ایمان، درحقیقت وہ آئیڈیالوجی، وہ نظریہ ہے جو زندگی کا صحیح تصور عطا، اور اس کا نصب العین متعین کرتا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی ہی ہے جس کی بنیادوں پر اعمال انسانی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہی، کسی کام کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار بنتی ہے۔ اسی کے مطابق انسانی اعمال اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ انسانی عمل کا جذبہ محرکہ ہی اس کا ایمان (آئیڈیالوجی) ہوتا ہے۔ اور یہی اس کے لئے صحیح اقدارِ حیات متعین کرتا ہے۔ اقدار (Values) نہ ہوں تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب زندگی کو محض آب و گل کا کھیل سمجھا جائے اور موت کو اس کا انجام، تو انسانی زندگی، حیوانی سطح سے بلند نہیں ہوتی۔ یہ صحیح آئیڈیالوجی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے اشتراکیت جیسا معاشی نظام، جو سرمایہ داری کے مقابلہ میں کہیں انسانیت ساز ثابت ہو سکتا تھا، پروان نہیں چڑھ رہا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن، ایمان (آئیڈیالوجی یا صحیح نظریہ حیات) کو اپنے معاشی نظام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو اقتدار یا نظام، نظریہ حیات یا اقدار کے بجائے اشخاص سے وابستہ ہو، اس کی عمر، شخص متعلقہ کی عمر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نظریہ پر مبنی نظام، اشخاص کا محتاج نہیں ہوتا۔ جب تک وہ اقدار قائم رہیں وہ نظام بھی قائم رہتا ہے۔ یہی وہ عظیم اصولی حقیقت تھی جس کی وضاحت کے لئے کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ۔۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ (3:144) یعنی، اور تو اور، خود محمد ﷺ بھی بجز ایں

نیست کہ اللہ کے ایک پیغمبر ہیں۔ ان سے پہلے بھی خدا کے پیغامبر آتے رہے اور اپنی عمر پوری کرنے کے بعد دنیا سے چلے جاتے رہے۔ تو کیا اگر کل کو یہ بھی قتل کر دیئے جائیں' یا وفات پا جائیں' تو تم یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام صرف ان کی ذات سے وابستہ تھا' پھر اپنے نظام کہن کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ اور اس کی تشریح خلفیہ رسول' حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس طرح فرمائی کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات پر امت میں کہرام مچ گیا تو آپ نے حاضرین کو مخاطب کیا اور ان سے کہا کہ اس بات کو غور سے سن لو کہ جس شخص نے محمد ﷺ کی عبودیت اختیار کر رکھی تھی وہ سمجھ لے کہ اس کا معبود مر گیا ہے۔ لیکن جو خدا کا عبد تھا اسے اطمینان رکھنا چاہئے کہ اس کا معبود حی و قیوم ہے۔ وہ کبھی نہیں مرے گا۔ اس اعلان عظیم نے دین کے نظام کو شخصیتوں سے بلند لیجا کر اقدار و نظریات کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہ نظام اس وقت بگڑا جب مسلمانوں نے قرآنی نظریۂ زندگی کو چھوڑ کر غیر قرآنی نظریات و تصورات کو اختیار کر لیا' اور سارا زور شخصیتوں پر دینے لگ گئے یا شخصیتیں سارا زور اپنے آپ کو منوانے پر صرف کرنے لگ گئیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا ارفع و اعلیٰ نظریہ پیش کیا تھا اور اس نظریہ کے مطابق حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک ایسی امت کی تشکیل فرمائی تھی جو رنگ' نسل' زبان' وطن کی نسبتوں سے بلند ہو کر' ایک عالمگیر وحدت بن گئی تھی۔ اس باب میں' میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آئیڈیالوجی کی وحدت کی بنا پر وحدت امت اس صورت میں وجود پذیر ہو سکتی ہے جب اس آئیڈیالوجی کی نمود ہماری عملی زندگی میں ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو اور آئیڈیالوجی محض الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ جائے جسے رسمی طور پر دہرا لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے وحدت امت کبھی ظہور میں نہیں آ سکتی' ایسا کرنے والے افراد کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ آپ سوچئے کہ اس وقت دنیا میں ساٹھ ستر کروڑ مسلمان بستے ہیں جو زبانی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا خدا ایک' رسول ایک' قبلہ ایک' کلمہ ایک ہے۔ اس اقرار کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لاشعوری طور پر اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ سب مسلمان۔۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر۔۔ ایک قوم کے افراد ہیں۔ لیکن عملاً ہماری صورت یہ ہے کہ ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان تو ایک طرف' ایک ملک کے مسلمان باشندے بھی ایک قوم کے افراد نہیں۔ اس خود فریبی کا سخت مضرت رساں پہلو یہ ہے کہ' ہم آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایک قوم تو بنتے نہیں' اور دنیا نے آئیڈیالوجی سے الگ ہٹ کر' تشکیل قومیت کے جو عناصر تجویز کئے ہیں'۔۔ مثلاً نسل' یا وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل۔۔ انہیں' نہ صرف یہ کہ ہم اپناتے نہیں بلکہ انہیں خلاف اسلام قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر' اسلام کو ہم اپنی عملی زندگی میں رائج نہیں کرتے اور کفر کو ہم اپناتے نہیں۔ یعنی ہم نہ آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک قوم بنتے ہیں (جو قرآن کا تقاضا تھا) اور نہ ہی باقی اقوام عالم کے معیاروں کے مطابق ایک قوم بنتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا میں مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں' انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قومی اور اجتماعی نہیں۔ اس کا مشاہدہ آپ خود پاکستان میں کر سکتے ہیں۔ ہم اب بھی قوم نہیں بن سکے' انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کے سامنے اپنا اپنا انفرادی مفاد ہے۔ اجتماعی مفاد کسی کے پیش نظر نہیں۔ یہ ہوتا ہے حشر اس قوم کا جو آئیڈیالوجی کے الفاظ کو دہرا کر اس فریب نفس میں مبتلا ہو جائے کہ یہ اپنے نتائج عملاً مرتب کر دے گی۔

☆☆☆☆

اب پھر اسی مقام کی طرف آیئے جہاں سے میں نے اس سلسلے کو چھوڑا تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ نیکی اور سعادت کی راہ ارکان اسلامی کی رسمی پابندی نہیں۔ نیکی اور کشاد کی راہ اس کی ہے جو دین کے مقصود و منتہیٰ پر نگاہ رکھے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے دوسرے مقام پر کہا ہے۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینے اور مسجد الحرام کی آبادکاری کے مختلف کام سرانجام دے دینے سے انسان اس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو خدا اور حیات آخرت پر ایمان رکھے اور خدا کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرے۔ (تم اپنے خودتراشیدہ تصور مذہب کی رو سے کچھ ہی سمجھ لو) میزان خداوندی میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (جو ایسا سمجھتے ہیں وہ ظلم کرتے ہیں) اور خدا کا قانون مشیت یہ ہے کہ ظالمین پر فلاح و سعادت کی راہ کبھی نہیں کھلتی۔

یاد رکھو! جو لوگ خدا کے متعین کردہ نصب العین (آئیڈیالوجی) پر یقین محکم رکھتے ہیں اور نظام خداوندی کے قیام و بقا کے لئے اپنی جان و مال سے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں اور اس بلند مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ چھوڑنا پڑے اسے بلا تامل و توقف چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے مدارج معیار خداوندی کے مطابق بہت بلند ہیں اور یہی لوگ درحقیقت کامیاب و فائز المرام ہیں (20-9:19)۔

مساوات کے نمونے:

یہی وہ نظام تھا جس میں، کوئی فرد معاشرہ تو ایک طرف، (حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق) اگر کوئی کتا بھی بھوک سے مرجاتا تو معاشرہ کا سربراہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا تھا۔ اور یہی تھا وہ نظام جس میں مملکت کا سربراہ اس وقت تک گیہوں کی روٹی نہیں کھاتا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کا مقصد مساوات انسانیہ تھا۔ آپ ہمارے واعظوں کو جھوم جھوم کر بیان کرتے دیکھیں گے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا کوئی کپڑا کبھی تہہ کر کے نہیں رکھا اور حضرت عمرؓ منبر پر کھڑے تھے تو دیکھا گیا کہ ان کے تہبند میں دس بارہ پیوند تھے وہ ان واقعات کو بیان کر کے تاثر یہ دیں گے کہ یہ ان حضرات کی ذاتی اور انفرادی خوبیاں تھیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ فطری نتیجہ تھا اس نظام کا جس کی بنیاد انسانی مساوات پر تھی۔ وہ نظام جس میں تمام افراد معاشرہ کا معیار زیست ایک جیسا تھا جس میں جو ایک کو میسر آتا تھا وہی سب کو مہیا ہوتا تھا۔

مساوات سے مقصود:

آگے بڑھنے سے پہلے، میں اس مساوات کی تھوڑی سی تشریح ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ مساوات ایسی نہیں تھی جیسے جیل خانہ میں قیدیوں کو ایک جیسی وردی پہننے کو اور ایک جیسی روٹی کھانے کو ملتی ہے (ضمناً، اب تو جیل خانوں میں بھی یہ مساوات باقی نہیں رہی۔ ایک امیر آدمی، اور غریب آدمی، ایک ہی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور عدالت سے انہیں ایک ہی جیسی سزا ملتی ہے۔ لیکن جیل خانہ میں امیر آدمی کو اے کلاس دے دی جاتی ہے اور غریب آدمی کو سی کلاس۔ اور دیگر آسائشوں کے علاوہ، یہی سی کلاس قیدی، اس اے کلاس والے کو بطور خدمت گار عطا کر دیا جاتا ہے۔ یعنی دونوں ایک جیسے مجرم ہیں لیکن ان میں سے

وہاں بھی ایک آقا ہے اور دوسرا اس کا غلام) بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ مساوات انسانیہ سے مراد، جیل خانہ کی سی مساوات نہیں اس سے مراد ایسی مساوات ہے جو ایک شریف گھر کے افراد میں ہوتی ہے۔ اس میں، گھر کی آمدنی میں سے ہر ایک فرد خاندان کو اس کی ضروریات کے بقدر ملتا جاتا ہے۔ ان میں فرق ضروریات کا ہوتا ہے۔ معیار زندگی کا نہیں۔ یہی کیفیت قرآنی نظام میں افراد معاشرہ کی ہوتی ہے۔ اس میں، قوم کے سارے بچوں کو ابنائے ملت سمجھا جاتا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد، ہر ایک کی صلاحیتوں کے مطابق تقسیم کار کر دی جاتی ہے۔ ہر فرد اس کام کو نہایت محنت اور دیانت سے سرانجام دیتا ہے جو اس کے سپرد کیا جاتا ہے، اور نظام معاشرہ اس کی اور اس کے بال بچوں کی ضروریات زندگی مہیا کئے چلا جاتا ہے۔ اس میں معیار زیست تو سب کا ایک ہوتا ہے، لیکن انفرادی ذوق و پسند کا میدان وسیع ہوتا ہے۔۔ یعنی انسان اور انسان سب برابر (اس میں مرد اور عورت کی بھی کوئی تخصیص و تمیز نہیں) معاشرہ میں مدارج ہر ایک کے جوہر ذاتی، بلندی سیرت و کردار اور حسن کارکردگی کے مطابق۔ اور ضروریات زندگی کے مہیا کئے جانے میں انفرادی حسن ذوق کے مطابق انتخاب کی گنجائش۔ جوں جوں قومی دولت بڑھتی جائے، معاشرہ کا معیار زیست بلند ہوتا چلا جائے۔ یہ ہے نقشہ قرآنی نظام معاشرہ میں مساوات انسانیہ کا۔ یہی تھی وہ مساوات جس کے لئے اس نظام کے ارکان۔۔ صلوٰۃ، صیام، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔۔ کا تعین کیا گیا تھا۔ ہمارا واعظ اب بھی مساوات کا ذکر کرتا ہے، اور بڑے فخر کے ساتھ کرتا ہے۔ لیکن اب اس مساوات کی صرف رسم باقی ہے۔ اس کی روح اور حقیقت غائب ہے۔ اب بھی ہماری مسجدوں میں ''محمود و ایاز'' ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن ان میں یہ مساوات صرف مسجد کی صف تک محدود ہوتی ہے۔ مسجد سے باہر نکلتے ہی۔۔ بلکہ اس صف سے اٹھنے کے بعد، صحن مسجد میں ہی ء۔۔ محمود، محمود ہوتا ہے اور ایاز، ایاز۔۔ عرفات کے میدان میں بھی بے شک امیر اور غریب سب ایک بن سلی چادر میں ملبوس کھڑے ہوتے ہیں لیکن وہاں سے لوٹنے کے بعد، امیر حاجی جس ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں رات بسر کرتا ہے، غریب بیچارا اس کا تصور مرنے کے بعد کی جنت میں ہی کر سکتا ہے اس زندگی میں کبھی نہیں کر سکتا۔

ہمارا واعظ اب بھی بتاتا ہے کہ دیکھئے۔ روزہ میں غریب اور امیر ایک ہی طرح سارا دن بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں۔ یہ اسلامی مساوات ہے۔ لیکن وہ اس فرق کو کبھی سامنے نہیں لاتا جو ان دونوں کی سحری اور افطار میں ہوتا ہے۔ امیر کے بیٹے کی پہلی افطاری کے جشن میں جو کچھ ایک شام کو صرف ہو جاتا ہے وہ اس غریب کی سال بھر کی آمدنی سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

اجتماع عید کا منظر:

اس رسمی اور رویتی مساوات کا بھانڈا بالآخر، عیدگاہ میں جا کر پھوٹتا ہے۔ جس انداز سے عید کے چاند کا انتظار ہوتا ہے اور جس ذوق و شوق اور جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا جاتا ہے، اس سے یوں نظر آتا ہے گویا ساری قوم ہمہ تن جشن مسرت ہے لیکن صبح جب عید کے اجتماع کے لئے جائیے، تو دور ہی سے یہ آوازیں فضا میں تھرتھری پیدا کرتے دکھائی دیتی ہیں کہ ''بابا! خدا کے نام پر۔۔ چار پیسے دیتے جائیے۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔'' ''میاں صاحب! اللہ کے واسطے میری جھولی میں کچھ ڈالتے جائیے۔ میں ایک لاوارث بیوہ ہوں جس کے بچوں کے تن پر سردی سے بچنے کے لئے کپڑا تک نہیں۔'' دوسری طرف

سے یہ دلگداز اور جگر خراش صدا وجہ سوہان روح بنتی ہے کہ ''بابا! میں تین مہینے سے بیمار اور لاچار ہوں۔ میری دوائی کے لئے کچھ دیتے جایئے۔ خدا تمہاری نماز، روزے قبول کرے گا۔'' یہ زہرہ گداز اور دل سوز آوازیں سنتے سنتے آپ عیدگاہ میں داخل ہوں، تو وہاں اس سے بھی زیادہ جگر پاش منظر دکھائی دے گا۔ فاقوں کے مارے ہوئے زرد زرد چہرے۔ افلاس وغربت کے جھنجھوڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے، افسردہ پیشانیاں، پژمردہ آنکھیں۔ پوری فضا پر عبرت انگیز مایوسیوں کی ہولناکی مسلط۔۔ اس سے پہلے، پھر بھی ایسا ہوتا تھا کہ ہر شخص کو بالعموم اور بچوں کو بالخصوص کم از کم سال میں ایک بار، عید کے موقعہ پر، نئے کپڑے ضرور مل جاتے تھی اب آپ عیدگاہ کے اجتماع پر نگاہ ڈالئے۔ شاید ایک فیصد نمازی بھی ایسے نظر نہ آئیں گے جو نئے کپڑوں میں ملبوس ہوں۔ باقی سب نے انہی پرانے کپڑوں کو دھو کر تن ڈھانپ رکھا ہوگا۔ اور ان میں بھی اکثر ایسے جنکے کپڑوں کے چیتھڑے اڑے ہوئے ہوں۔۔ ادھر چندہ مانگنے والے صفوں میں جھولیاں لئے پھر رہے ہیں۔ ادھر امام صاحب صدقۂ فطر کے فضائل بیان فرما رہے ہیں۔۔ اس سے وہ سرمایہ داروں کو جنت کی بشارتیں دیتے ہیں اور غریبوں اور محتاجوں کو تقدیر خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین فرماتے ہیں اور اس طرح ان کی نگاہ کبھی اس باطل نظام کی طرف اٹھنے نہیں دیتے جس کی پیدا کردہ ناہمواریوں کا نام تقدیر خداوندی رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ ہے اس قوم کا جشن عید، جسے جشن کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یاد رکھئے! جس جشن میں قوم کا ایک فرد بھی حقیقی مسرت سے محروم رہ جائے، وہ جشن، جشن نہیں۔ قوم کی بدنصیبی کا ماتم ہے۔ عید اسی قوم کی ہے جسے رزق (حضرت عیسیٰ ؑ کے الفاظ میں) خدا کے آسمانی نظام کی رو سے ملتا ہے اور جس میں ہر فرد معاشرہ، بلا منت غیرے، بطور استحقاق، برابر کا شریک ہوتا ہے۔ جس قوم کو انسانوں کے خودساختہ نظام کے تابع رزق ملے۔۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ چند افراد تو قارون کے خزانے کے مالک ہوں اور باقی افراد معاشرہ روٹی کے ٹکڑے کے لئے بھی ترس رہے ہوں۔ اور اگر انہیں وہ ٹکڑہ ملے بھی تو شرف وتکریم انسانیت بیچ کر ملے۔۔ اس قوم کی عید، ایک مقدس فریب سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وہ عید ہے جس کا ہلال، اس قوم کی ہنسی اڑاتا ہے، اور دنیا کی قومیں جس کی فریب خوردگی کا تماشہ دیکھنے کے لئے دور دور سے آتی ہیں۔

دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ اسی (عید کی) نماز کے لئے امام نے بتایا تھا کہ اس میں چھ زائد تکبیریں ہوتی ہیں۔ تکبیر کے معنی ہیں۔۔ اللہ اکبر کا اعلان۔۔ مذہب میں چھ چھوڑ کر، چھ سو مرتبہ بھی اللہ اکبر کہئے تو اس کا، دو لفظ دہرانے سے زیادہ نہ کوئی مفہوم ہوتا ہے، نہ کوئی نتیجہ۔ لیکن دین کے نظام میں اللہ اکبر کے اعلان کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ خدا کے قانون سے بالا کوئی قانون نہیں اور آسمانی نظام سے برتر کوئی نظام نہیں کائنات میں اقتدار اعلیٰ صرف خدائی نظام کو حاصل ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں میں اکبر واصغر کی کوئی تفریق نہیں اس لئے کہ نہ کوئی کسی کا محتاج ہے نہ محکوم۔۔ سوچئے کہ اس تکبیر میں اور نماز عید کی موجودہ تکبیروں میں کس قدر فرق ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جشنِ عید شاہیں بچوں کا حق ہوتا ہے۔۔ مردار خور کرگسوں کا نہیں! والسلام

عید مبارک

جشنِ نزولِ قرآن مجید

پر پیشگی ہدیہ تبریک قبول فرمایئے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۵۸ (10:58-57)

اے نوعِ انسانی! تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات آ گیا ہے جو ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے سینوں کو وقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ جو قوم اس کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے یہ اس کی راہنمائی، زندگی کی منزلِ مقصود کی طرف کرتا ہے اور اسے سامانِ نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

کہو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے عطا ہوا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسے ضابطۂ حیات کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یہ اس تمام ساز و سامان سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے ہو۔

مرتبہ محمد سلیم اختر خاں

قیامِ پاکستان کے بعد پہلی عید کی کہانی پرویز صاحب کی زبانی

(ماخوذ از درسِ قرآن از پرویز' مورخہ 15 اگست 1980ء۔ تصویر اگلے صفحہ پر دیکھئے۔)

عید آزاداں شکوہِ ملک و دیں عید محکوماں ہجومِ مومنین

مفہوم: آزاد قوم کی عید، ملک اور دین کی شان و عظمت کا شہکار ہوتی ہے جبکہ غلاموں کی عید صرف مسلمانوں کا ایک پریشان حال ہجوم ہے۔ (س۔ا)

''عید تو میں نے کہا آزاد لوگوں کی ہوتی ہے' محکوموں کی عید کیا صاحب! ایک ہجوم ہے اکٹھا ہو گیا۔ وہاں جو آئے تو ذہن میں آیا کہ اب جو عیدِ آزاداں ہے' اس کی پہلی عید ہمیں میسر ہوگی' وہ ساری خوشیاں ہمارے ذہن میں تھیں اور ہمیں پہلی عید جو آئی اپنی آزاد مملکت میں تو وہ اس کیفیت سے عید آئی تھی۔ عجب کیفیت ہے' میں اس کیف اور سرور کو نہیں بھول سکتا جو وہاں عید کی دو رکعتوں میں مجھے سعادت نصیب ہوئی۔ قائداعظمؒ (محمد علی جناح) اگلی صف میں تھے' ان کے بعینہٖ ٹھیک پچھلی صف میں' بالکل ان کے پیچھے' میں کھڑا تھا۔ ایک عظیم شخصیت جس نے ہندو جیسی قوم کی غلامی کی زنجیروں سے چھڑا کر ہمیں آزادی دی تھی۔ وہ مردِ مومن جنہیں میں دس سال سے قریب سے جانتا تھا' دل بھی مومن' دماغ بھی مومن بڑی بلند شخصیت اور ان کے پیچھے یہ سعادت کہ دو رکعتیں نماز کی ادا کی گئیں۔ اقبالؒ (1877-1938ء) نے ''جاوید نامہ'' میں کہا ہے' عجیب چیز ہے۔ وہاں تو دو رکعتیں وہ جلال الدین افغانی اور سید حلیم پاشا کے ذکر میں آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ؎

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است

اس قسم کے انسانوں کے ساتھ اگر کہیں دو رکعت نماز کی مل جائے' اطاعت اس کو کہتے ہیں۔

ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است

''ورنہ او دیہاڑی ہوندی ہیگی اے' جیہدی جنت ملدی ہوندی ہیگی آ'' کیا بات ہے اقبالؒ کی!

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است

میں نے کہا ہے کہ اس کے لئے دیہاڑی کا ہی لفظ صحیح آتا ہے' ورنہ یہ وہ کام ہے جس کی مزدوری جنت مل جاتی ہے۔ اطاعت تو اس قسم کے مردوں کے ساتھ دو رکعتیں ادا کرنا ہیں۔ عزیزانِ من! وہ دو رکعتیں جو میں نے ادا کی ہیں' اس مردِ مومن کے پیچھے کھڑے ہو کر' میں ساری عمر ان کا کیف و سرور نہیں بھول سکتا۔ لیکن اس عید کے بعد جب وہ کھڑے ہوئے اور ہجوم کر کے لوگ ملنے کے لئے جا رہے تھے' ان کی آنکھوں کا جو نم تھا وہ مجھ سے ہزار داستانیں کہہ رہا تھا۔ عید کی خوشی میں مل رہے تھے لوگوں سے' جگر میں ٹیس لب ہنسنے پہ مجبور' عزیزانِ من! وہ پہلی عید جس طرح سے غم آلود گزری' 33 سال ہو گئے' 33 عیدیں آئیں' ایک عید بھی تو خوشی کی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ پتہ نہیں کہ یہ طرح ایسی پڑ گئی اس پہلی عید کی ہمارے ہاں' میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوا۔ ''عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں'' ایک شاعر کا مصرع ہے' وہ اس لئے کہ اس نے سچ کہا تھا اس نے عیدِ آزاداں کہا تھا۔ آزادی محض مملکت کے نقشے کے اوپر لکیر کھینچنے سے تو حاصل نہیں ہو جاتی۔ آزادی اور چیز ہوتی ہے۔ ملک کا آزاد ہو جانا اور چیز ہوتا ہے' انسانوں کا آزاد ہونا اور چیز ہوتا ہے۔ وہ نہیں نصیب ہو سکی۔ اس کے باوجود آپ جانتے ہیں کہ میں تو ان میں سے ہوں جو کہا کرتا ہوں کہ ؎

مِلّت کے ساتھ رابطۂ اُستوار رکھ پیوستہ رہ شجر سے' اُمیدِ بہار رکھ! (اقبال: بانگِ درا)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مکتوبِ پرویزؒ بنام خالد گل صاحب

عزیز محترم

آپ دیارِ عرب میں قرآنی شمع کو فرزاں رکھنے کے لئے جس قدر گرم جوشی سے کام کر رہے ہیں اس سے میں بے حد مطمئن اور پر مسرت تھا کہ آپ کو پورا پورا اطمینانِ قلب حاصل ہے لیکن اگلے دنوں ڈاکٹر صاحب اور عزیزہ بیٹی رشیدہ آئے تو انہوں نے بتایا کہ آپ ان دنوں کچھ پریشان خاطر رہتے ہیں اس سے مجھے تعجب بھی ہوا۔ تاسف بھی اور صدمہ بھی۔

تعجب اس بات سے کہ آپ جیسا گرم جوش مطمئن قلب پریشان کس طرح ہو گیا۔ تاسف اس پر کہ آپ نے اپنی پریشانی کے متعلق مجھ سے ذکر کیوں نہ کیا اور صدمہ اس سے کہ آپ جیسی قیمتی زندگی بلا وجہ کم ہو رہی ہے۔

عزیز من! یوں تو ہر زندگی قابل قدر ہوتی ہے لیکن جس شخص کے سامنے زندگی کا کوئی بلند مقصد ہو اس کی زندگی کا تو ایک ایک لمحہ بے بہا ہے۔ میں اب عمر کے اعتبار سے اس مقام پر ہوں جہاں اگلا ساحل زیادہ قریب ہوتا ہے۔ وہ جوان سال جن پر مجھے بھروسہ ہے کہ یہ میرے بعد بھی اس شمع کو روشن رکھیں گے ان میں ایک آپ بھی ہیں۔ میں نے آپ کا باہر جانا اس لئے گوارہ کر لیا تھا کہ آپ وہاں کچھ مالی مفاد حاصل کر کے واپس آئیں گے تو پھر اقتصادی طور پر مطمئن ہو کر اس بلند مقصد کے فروغ کے لئے کوششیں کر سکیں گے۔ اندریں حالات آپ سمجھئے کہ آپ کی زندگی آپ کے بچوں کے لئے کس قدر متاعِ حیات ہے۔

ان بچوں کے لیے جنہیں دنیا میں لانے کے آپ ذمہ دار ہیں ان کی پرورش تعلیم و تربیت آپ کا اولین فریضہ ہے اور اس سے اگلی سطح پر قرآنی مشن کے لیے آپ کی زندگی کس قدر بے بدل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی ہماری رہتی ہی نہیں۔ یہ ہمارے پاس امانت ہوتی ہے وہ امانت جس کے (غالب کے الفاظ میں) ایک ایک قطرے کا ہمیں حساب دینا ہوتا ہے (خدانخواستہ) کوئی ایسا طبیعی حادثہ ہو جائے جس پر ہمیں اختیار نہ ہو۔ تو وہ اور بات ہے ورنہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ جس اقدام سے زندگی یا صحت کے کم ہو جانے کا اندیشہ ہو اس کی روک تھام کا فوری انتظام کریں۔ اس کا ہمیں حساب دینا ہوگا اور اسی کی ہم سے پرسش ہوگی۔ ذرا سوچئے کہ وہ زندگی جس نے قرآنی مشن کے لئے وجہ فروغ ہونا تھا اگر ہم اس کی حفاظت کی طرف سے غفلت برتیں تو اس سے انسانیت کا کس قدر نقصان ہوگا اور عدالت خداوندی میں یہ کتنا بڑا جرم! ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ ﴿۸﴾ (102:8) تم سے ان بے بہا نعمتوں کی بابت پوچھا جائے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو کوئی جسمانی عارضہ نہیں (یہ اللہ کا فضل ہے) اس لئے آپ کی پریشانی کی وجہ نفسیاتی (Psychological) ہے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ والدہ

مرحومہ کی وفات کا آپ پر بڑا اثر ہوا ہے۔ آپ کو ان سے اور انہیں آپ سے بڑا پیار تھا۔ لیکن اس غم کو دل پر لگاتے وقت آپ نے قرآن کے اس عظیم سبق کو نظر انداز کر دیا جس میں اس نے کہا کہ ''اور تو اور'' اگر محمد ﷺ جیسی شخصیت بھی کہ جو تمہارے لئے متاع کونین ہے کل کو وفات پا جائے تو تم یہ نہ سمجھ لینا کہ بس! زندگی کے مقاصد ختم ہو گئے۔ اگر تم نے ایسا سمجھ لیا تو وہ تو اپنی طبیعی موت سے وفات پا گئے تھے تم اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لو گے۔ اس لئے عزیزم کسی بڑی سے بڑی اور پیاری سے پیاری شخصیت کی جدائی کو ہمارے لیے نا قابل تلافی نقصان کا موجب نہیں بن جانا چاہئے۔ اس قسم کا اثر نفسیاتی ہوتا ہے اور اس کا علاج انسان کے خود اپنے ہاتھ میں یعنی عزم راسخ (Determination) اس امر کو مستحکم کیجئے کہ مجھے زندگی کے بلند مقاصد کے لئے جینا اور تندرست رہنا ہے یہ احساس تم سے زائل ہو جائے گا۔ آپ نے پچھلی دفعہ اپنی بچی کی الجھن کا مجھ سے ذکر کیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اب کسی اسکول میں جانے لگی ہے۔ یہ بہت اچھا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ اسکول کیسا ہے اگر کوئی ایسا سکول ہو جس میں استانیاں یورپین ہوں تو وہ زیادہ اچھا رہتا ہے ان استانیوں کو بچوں کی سائیکالوجی کے لئے خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ اور وہ انہیں نہایت عمدگی سے (handle) کرتی ہیں۔

لیکن جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں آپ کی (اور دیگر اہلِ خاندان کی) پریشانی کی بنیادی وجہ عزیزہ بیٹی کا مسئلہ ہے آپ چونکہ ایسے معاملات میں زیادہ حساس واقعہ ہوئے ہیں اور عزیزہ آج کل آپ کے پاس ہی ہے۔ اس لئے آپ نے اس قدر شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کا زیادہ اثر لیا ہے لیکن اس مسئلہ کا حل تو خود اس بیٹی کے پاس ہے۔ رشتے اچھے مل سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اس کے لئے آمادہ ہو۔ کوشش کیجئے کہ وہ اس کے لیے آمادہ ہو جائے تو آپ کا ہی نہیں پورے خاندان کا ایک مسئلہ حل ہو جائے گا۔

لیکن یہ مسائل حل ہوں یا نہ۔ آپ کو ان کا ایسا اثر نہیں لینا چاہئے جس سے آپ کی صحت (اور بامقصد زندگی) متاثر ہو جائے۔ اس کا علاج اس عزم کا پختہ کرنا ہے کہ آپ نے ایک عظیم مقصد کے حصول کے لئے زندہ اور تندرست رہنا ہے۔ اس سے آپ کی قوت ارادی میں استحکام پیدا ہو گا اور وہ اس قسم کی نفسیاتی الجھن کی مدافعت کر دے گی۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس پر توجہ سے غور کریں گے۔

یاد رکھئے! مجھے آپ کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انگلیوں کی تکلیف کی وجہ سے اب خطوط خود نہیں لکھا کرتا۔ املا کرا دیا کرتا ہوں۔ لیکن یہ خط مجھے خود ہی لکھنا تھا۔ بمشکل لکھ پایا ہوں۔ اس کے جواب کا مجھے شدت سے انتظار رہے گا۔

والسلام

خیر طلب

باباجی

18 اگست 1980ء

علامہ غلام احمد پرویز علیہ الرحمہ

کیا قائداعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟

(سردار شوکت حیات کو غلط فہمی ہوئی ہے)

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی زندگی کا آخری مضمون
جو پریس میڈیا میں شائع ہوا

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ نے اپنی نہایت کمزور صحت کے باوجود 25 اپریل 1984ء کو 25 بی گلبرگ 2، لاہور میں روزنامہ جنگ لاہور کے نمائندگان جناب ضیا شاہد صاحب، جناب اسد اللہ غالب صاحب اور جناب ارشاد عارف صاحب کو انٹرویو دیا جس کی ویڈیو بھی ادارہ طلوع اسلام کے پاس دستیاب ہے۔ روزنامہ جنگ لاہور نے 4 مئی 1984ء کے جمعہ میگزین میں جناب پرویزؒ کے انٹرویو میں دیئے گئے جوابات پر مشتمل مضمون کی صورت میں شائع کیا۔ چونکہ یہ مضمون نہایت اہم ہے۔ اور جناب پرویزؒ کا پریس میڈیا میں شائع ہونے والا آخری مضمون ہے اور آج بھی نہایت تازہ حالات کی روشنی میں پاکستانیوں کی خصوصاً اور عوام الناس کی عموماً راہنمائی کے لئے بہت ضروری معلومات کا حامل ہے، اس لئے بشکریہ روزنامہ جنگ لاہور اس مضمون کو دوبارہ ماہنامہ طلوع اسلام کی زینت بنایا جا رہا ہے۔

روزنامہ جنگ (لاہور) کے جمعہ میگزین ایڈیشن (بابت 13 الغایت، 19 اپریل 1984ء) میں سردار شوکت حیات کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے (ملخصاً) کہا ہے کہ قائداعظمؒ پاکستان کو اسلامی مملکت نہیں بلکہ سیکولر فلاحی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ اس کی تائید میں انہوں نے قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں جو سردار شوکت حیات نے کہی ہو۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کے شوشے چھوڑے جاتے رہے ہیں۔ مدون طور پر اسے جسٹس محمد منیر (مرحوم) نے اپنی کتاب From Jinnah To Zia میں چھوڑا تھا جس کا تفصیلی جواب میں نے اپنے ایک مقالہ میں دیا تھا۔

چونکہ سردار شوکت حیات نے اپنے انٹرویو میں وہی اعتراضات دہرائے ہیں جنہیں جسٹس (مرحوم) نے اپنی کتاب میں پیش کیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے مذکورہ صدر مقالہ کی اشاعت اس کوشش کو ناکام بنانے میں موثر ثابت ہوگی جو تاریخ کو مسخ کرنے اور قائداعظمؒ کے خلاف الزام تراشنے کے لئے کی جارہی ہے۔ تحریک پاکستان کے سلسلے میں بالعموم اور قائداعظمؒ کے ضمن میں بالخصوص، جو کچھ میں کہتا چلا آ رہا ہوں اور کہوں گا، وہ شنید نہیں، دید ہے۔ میں (اپنے متعلق اکثر کہا کرتا ہوں کہ میں) 1930ء کا پاکستانی ہوں۔ جب علامہ اقبال نے (الٰہ آباد کے مقام پر) اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا کہ اسلام ایک زندہ حقیقت صرف اپنی آزاد مملکت میں بن سکتا ہے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے مسلمانان ہند کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کے بعد جب قائداعظمؒ اس شمع کو لے کر آگے بڑھے تو میں نے ملازمت میں ہونے کے باوجود تقریباً دس سال تک ان کی معیت اور قیادت میں اپنے انداز سے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ اس زمانہ کے طلوع اسلام کے فائل اس کے شاہد ہیں۔

قائداعظمؒ کے ساتھ اس قرب کی بنا پر مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ وہ کس قسم کا اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے لیکن میں جو کچھ عرض کروں گا وہ میرے ذاتی علم پر مبنی نہیں ہوگا کیونکہ کسی کا ذاتی علم تاریخی سند قرار نہیں پا سکتا۔ میں جو کچھ کہوں گا وہ قائداعظمؒ کے ان بیانات اور تقاریر پر مبنی ہوگا جو چھپ کر محفوظ ہو چکی ہیں عام طور پر یہ مغالطہ پیدا کیا جاتا ہے کہ چونکہ قائداعظمؒ تھیاکریسی نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے اس سے ثابت ہوا کہ وہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے، بڑی رکیک اور بودی ہے۔ تھیاکریسی اسی طرح خلاف اسلام ہے جس طرح سیکولرازم۔ لہٰذا قائداعظمؒ جس طرح سیکولرازم کے خلاف تھے، اسی طرح تھیاکریسی کے بھی خلاف تھے۔ تھیاکریسی کہتے کسے ہیں، اسے انہوں نے اپنے اس پیغام میں واضح کر دیا تھا جو انہوں نے بحیثیت گورنر جنرل، فروری 1948ء میں اہل امریکہ کے نام براڈ کاسٹ کیا تھا۔ اس میں انہوں نے پاکستان کے دستور کے متعلق فرمایا تھا۔۔۔

> پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہو گی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدت انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئین پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو، یہ امر مسلمہ ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔
>
> (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل، ص 65)

تھیا کریسی کی مخالفت:

اس براڈ کاسٹ کے آخری فقرہ میں قائداعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتادیا کہ تھیا کریسی وہ نظام حکومت ہوتا ہے جس میں اقتدار مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ قائداعظمؒ اس طرز حکومت کے خلاف تھے کیونکہ یہ اسلام کے خلاف ہے اور قرآن آیا ہی اسے مٹانے کے لئے تھا۔

علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں تھیا کریسی کے خلاف تھے اور سخت خلاف۔ اس لئے کہ تھیا کریٹک سٹیٹ اور اسلامک سٹیٹ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے تھیا کریسی کے خلاف کیا کچھ اور کتنا کچھ لکھا تھا' اس کی وضاحت کا یہ مقام نہیں۔ یہاں ان کے صرف ایک بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی 23 مارچ 1932ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور جس میں انہوں نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری' ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات وجذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں' جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی' سیاسی' بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں' نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

انہوں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی ہوگا اور یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ ''اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ..... حسبنا کتاب اللہ..... ''ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔''

(خطبات اقبالؒ)

قائداعظمؒ نے 5 فروری 1938ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے نوجوان طالب علموں سے کہا تھا کہ:

''مسلم لیگ نے ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خودغرضی کا' مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناپسندیدہ عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔''

(تقاریر قائداعظمؒ حصہ اول' ص 48)

اس سے ان کی مراد تھیا کریسی کی مخالفت تھی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے 11 اپریل 1946ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ جنگ کر رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین تھیا کریسی نہیں۔ ہم تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔

(تقاریر جناح، شائع کردہ، شیخ محمد اشرف، جلد دوم، ص 386)

اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیات:

وہ تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں بلکہ اسلامک سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اسلامک سٹیٹ کے اصول و معانی کیا ہوتے ہیں یہ موضوع بڑی تفصیل چاہتا ہے (میں اس کے متعلق صدہا صفحات لکھ چکا ہوں) اس کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ اس میں کسی انسان کو حق حکومت حاصل نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو انہوں نے حیدرآباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کو 1941ء کو انٹرویو دیتے ہوئے ایسے جامع انداز میں سمٹا کر بیان کر دیا تھا جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی..... انہوں نے فرمایا تھا:

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تکمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(اورینٹ پریس بحوالہ روزنامہ انقلاب، لاہور، مورخہ 8 جنوری 1942ء)

مطالبہ پاکستان کا مقصد:

اب آیئے اس حقیقت کی طرف کہ وہ مقصد کیا تھا جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا اور قائداعظمؒ اور مخالفین مطالبہ پاکستان کے مابین جنگ کس بات پر ہوئی تھی؟ وہ جنگ صرف اس بنا پر لڑی گئی تھی کہ قائداعظمؒ اسلامی ریاست متشکل کرنا چاہتے تھے اور مخالفین پاکستان (ہندو اور مسلمان نیشنلسٹ) سیکولر سٹیٹ کے حامی تھے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی وسعت طلب ہے۔ میں چند ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔۔۔ قائداعظمؒ نے جب مذہب (دین) کی بنیادوں پر مملکت قائم کرنے کا مطالبہ پیش کیا تو (اس زمانے کے) کانگریس کے ایک نامور لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں (جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے) پکار کر کہا۔۔۔

اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظام حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو، وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف

کرلیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام، یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے۔ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظام حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بہترین نظام حکومت اس نظریہ پر قائم ہوسکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہوکر ایک قوم بن جائیں۔

(ہندوستان ٹائمز، 5-9-1938)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا تھا:

حکومت الٰہیہ کا تصور ایک داستان پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔

(ہندوستان ٹائمز، 14-11-1939)

1940ء میں جب قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا تھا:

اگر مذہب کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے یعنی ایک نجی کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہ عمل بھی مشترک ہو۔

(ہندوستان ٹائمز، 9-6-1940)

اسی رو میں مسٹر گاندھی نے 1946ء میں لکھا تھا:

اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ؟ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے..... مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔

(ہریجن، 9-12-1946)

مسٹر گاندھی کا یہ ردعمل، قائداعظمؒ کے اس خط کا نتیجہ تھا جو انہوں نے اول الذکر کو یکم جنوری 1940ء کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے (مسٹر گاندھی سے) کہا تھا:

آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے، لیکن جب خود آپ

سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح؟ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے) آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے، جس مذہب کو انسانی معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ زندگی انسانی نہیں۔ محض غوطہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور وشغب تو بہت ہوتا ہے، لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(تقاریر جناح، جلد اول، ص 140-139)

قرآن مجید کی عظمت:

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قائداعظمؒ نے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اسلامی مملکت وہ ہے جس میں قرآن عظیم کی حکمرانی ہو۔ انہوں نے قرآن مجید کی عظمت اور جامعیت کا کسی ایک بیان میں ذکر نہیں کیا، وہ پوری تحریک پاکستان کے دوران اس حقیقت کو دہراتے رہے۔ مثلاً اپریل 1943ء کا ذکر ہے۔ صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائداعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

> تم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہنمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتاب عظیم، قرآن کریم۔

(تقاریر، جلد اول، ص 516)

13 نومبر 1939ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فساد برپا ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا:

> جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعل ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے؟

(تقاریر، جلد اول، ص 108)

دسمبر 1943ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے خود ہی سوال اٹھایا۔

> وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں، وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی

ملت کی عمارت استوار ہے، وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا!

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی عظیم کتاب، قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی..... ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول ﷺ، فلہٰذا ایک قوم۔

(تقاریر، جلد دوم، ص 50)

انہوں نے 1945ء میں، ملت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگہ بصیرت ہمیشہ وجد کرتی رہے گی..... آپ نے فرمایا:

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مورخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''بحر اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوع انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین غیر متبدل، منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس کے بعد قائداعظمؒ فرماتے ہیں:

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطہ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی تقاریر ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ اس سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت نہیں)۔

(تقاریر، جلد دوم، ص 300)

حیدرآباد (دکن) کے جس انٹرویو کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اس میں جب طلبہ نے یہ سوال کیا کہ ''مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟ تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا:

جب میں انگریزی زبان میں مذہب (Religion) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کی رو سے میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ

ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی' سیاسی ہو یا معاشی' غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے' اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

انہوں نے اپنی اس پکار کو اس شدومد سے دہرایا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو گیا کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے ہیں۔

دشمنوں کی گواہی:

یکم نومبر 1941ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرز حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے' مختصر یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطہ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔

(ٹریبیون' 2-11-1941)

ضمناً' اوائل 1977ء کا ذکر ہے۔ جرمنی میں پاکستان ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام قائداعظمؒ کے جشن صد سالہ کی ایک تقریب منائی گئی۔ اس میں ایک جرمن سکالر' پروفیسر ڈاکٹر کراہنن (Krahnan) نے اپنی تقریر کے دوران کہا تھا:

قائداعظم محمد علیؒ کے سامنے ماڈل' قرآن مجید تھا۔

(پاکستان ٹائمز' 3 فروری 1977ء)

یعنی بھارت کے مسٹر منشی اور جرمنی کے سکالر تک تو جانتے تھے کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت بنانا چاہتے تھے لیکن نہیں جانتے تھے تو ہمارے محترم جسٹس محمد منیر صاحب!

بوٹا بوٹا' پتہ پتہ' حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے' گل ہی نہ جانے' باغ تو سارا جانے ہے

قائداعظمؒ کی وفات کے بعد' ہندوستان ٹائمز نے اپنی 19 اکتوبر 1948ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا:

پاکستان بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ

پاکستان کے راہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد اس نے کہا:

اگر کشمیر کا مسئلہ پرامن طریقے سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی سٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔

کیا محترم جسٹس منیر صاحب نے اندازہ فرمایا ہے کہ قائداعظمؒ اور مخالفین میں باعث نزاع کیا مسئلہ تھا؟ یہ مسئلہ کہ قائداعظمؒ اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے اور مخالفین سیکولر سٹیٹ پر زور دیتے تھے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے' ہندو تو اس کے لئے بھی تیار تھا کہ اگر پاکستان اسلامی سٹیٹ بنانے کے دعوے کو ترک کر دے تو وہ اس کے ساتھ مفاہمت کرے گا۔

ہم نے پہلے کہا ہے کہ قائداعظمؒ کی طرف سے پیش کردہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت' ہندو نے بھی کی تھی اور قومیت پرست مسلمان لیڈروں نے بھی۔ ان میں سرفہرست نیشنلسٹ علماء کا طبقہ تھا۔ اگر ان کی بناء مخالفت سامنے آ جائے تو اس سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قائداعظمؒ کس قسم کی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے اور ان کے مخالفین کس قسم کی؟ یہ مخالف علماء باستثناء چند' دارالعلوم دیوبند کے مسلک سے متعلق تھے۔ دیوبند کا مسلک کیا تھا' اس کے متعلق متحدہ ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار مدینہ (بجنور) کی سترہ اپریل 1963ء کی اشاعت میں مولانا اسرار احمد آزاد دیوبندی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے لکھا تھا:

یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماء ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

یہ مقالہ ہی اس حقیقت کے ثبوت کے لئے محکم دلیل ہے کہ یہ حضرات سیکولر حکومت کے قائل تھے اور قائداعظمؒ اس طرز حکومت کے مخالف اور یہی ان دونوں میں بنا مخاصمت تھی' سیکولر نظام حکومت سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں ہر اہل مذہب کو اعتقادات' عبادات' رسوم و رواج اور شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی آزادی حاصل ہو اور امور مملکت میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ یہ تھی وہ سیکولر حکومت جس کے داعی نیشنلسٹ علماء تھے۔ اس زمانے میں اس گروہ کے سرخیل' دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمیعت العلمائے ہند کے صدر (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے..... ان کا ارشاد تھا:

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی سب شامل ہوں' حاصل کرنے کے لئے سب کو متحدہ کوشش کرنی چاہئے' ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے اور اسلام میں اس آزادی کی اجازت ہے۔ (زمزم' مورخہ 7 جولائی 1938ء)

(جاری ہے)

محمد انوار خان، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قرآن اور سنت

قرآن اور سنت یہ جو قرآنِ کریم کے ساتھ ''اور'' لگایا گیا ہے یعنی قرآن اور سنت، قرآن اور حدیث، قرآن اور اہلِ بیت یہ بھی بڑی بنیادی سازش ہے قرآنِ کریم کے ساتھ ''اور'' لگانے کی، اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ قرآن کریم میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی تھی۔ پہلے قرآن کریم کے ساتھ سنت اور حدیث کو دین میں حجت اور سند قرار دیا گیا اور پھر قران کریم کو ایک طرف کر دیا گیا اور ہر ایک نے سنت اور حدیث کے حوالے دیکھ کر اپنی مرضی اور اپنے فرقے کے مطابق دین کی تشریح کر دی اب ہر ایک فرقے کا جدا جدا اسلام ہے اور قرآن کریم کی آیات کو مردوں کو ثواب پہنچانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ جبکہ وحی ہم سے سوال کر رہی ہے کہ کیا ہمارے لیے قرآن کریم کافی نہیں ہے؟

کیا کافی نہیں ہے ان کے لیے جو کتاب ہم نے نازل کی ہے ان پر جو پڑھ کر سنائی جاتی ہے انہیں۔ (العنکبوت:51)

اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ (البقرہ:120)

قرآن کریم اس سفر زندگی کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو سب سے سیدھی ہے۔ (بنی اسرائیل:9)

اگر یہ قرآن کریم کو ہی دین میں سند مانتے تو کبھی فرقوں میں نہ بٹتے اور نہ ہی ان میں کوئی اختلاف ہوتا مگر سازش یہ تھی کہ مسلمان قرآن کریم سے راہنمائی نہ لے سکیں اس لیے قرآن کریم کے ساتھ اور چیزوں کو بھی سند قرار دیا گیا کبھی کسی مسلمان نے سنت کا مفہوم جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ دین میں سنت سے کیا مراد ہے؟ سنت کے معنی ہیں ''طریقہ'' سنت رسول کا مطلب ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآنِ کریم کے علاوہ کوئی اور طریقہ تھا؟ یقیناً آپ کا طریقہ قرآن کریم کے مطابق تھا اس لیے آپ کی زندگی کو قرآن کریم نے انسانوں کے لیے نمونہ قرار دیا ہے آج بھی جو عمل قرآن کریم کے مطابق ہوگا وہ اصل سنت رسول ہے خالص قرآن کریم سے راہنمائی لینا بھی سنت رسول ہے لہذا قرآن کریم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ سنت ایک ہی چیز ہے اگر قرآن اور سنت دونوں کو الگ الگ دین میں سند قرار دو گے تو پھر قرآن اور سنت کے مطابق کوئی ایسا پبلک لاء نہیں بن سکے گا جو تمام فرقے قبول کر لیں کیونکہ ہر فرقے کی سنت الگ ہے مودودی مرحوم بھی قرآن اور سنت کے مطابق نظام قائم کرنے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں مگر کامیاب نہیں ہو سکے بالآخر

مودودی صاحب نے بھی یہ تسلیم کرلیا تھا کہ قرآن اور سنت کے مطابق کوئی ایسا قانون نہیں بن سکتا جس کو سارے فرقے مان لیں (ایشیا ویک 23 اگست 1970) اس کے باوجود علماء نے آئین پاکستان میں یہ شق ڈلوائی ہے کہ کوئی قانون قرآن اور سنت کے علاوہ نہیں بن سکتا۔ پاکستان میں 70 کی دہائی میں نظام مصطفیٰ کی بہت کوشش کی گئی تھی مگر نافذ نہ ہوسکا اس کی بنیادی وجہ مولانا نورانی بریلوی اور مفتی محمود دیوبندی فرقے سے تھے ان دونوں حضرات نے نظام مصطفیٰ کے لیے ایک ساتھ کوشش تو کی مگر ایک ساتھ نماز نہیں پڑھی، نظام تو نہیں قائم ہوسکا البتہ اس کوشش میں بہت سارے سادہ لوح مسلمانوں کا خون ضرور ہوا ہے۔ مولانا نورانی اور مفتی محمود قرآن کریم کے بغیر نظام مصطفیٰ قائم کرنا چاہتے تھے یہ اس بات کو سمجھتے ہی نہیں تھے کہ جو نظام خالص قرآن کریم کے مطابق ہوگا وہ نظام مصطفیٰ ہوگا قرآن اور سنت کو الگ الگ کر کے کوئی قانون کوئی نظام قائم نہیں ہوسکتا نظام تو دور کی بات ہے یہ ایک جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتے۔ جنرل ضیاء الحق صاحب نے بھی بڑے خلوص سے کوشش کی تھی کہ پاکستان میں قرآن وسنت کا نظام قائم ہوجائے مگر کامیاب نہیں ہوسکا اگر جنرل ضیاء الحق صاحب اتنی کوشش خالص قرآنی نظام کے لیے کرتے تو پاکستان کی بلکہ دنیا کی تقدیر ہی بدل جاتی۔ نظام صرف قرآن کریم کے مطابق قائم ہوسکتا ہے قرآن کریم مکمل ضابطہ حیات ہے اور کسی بھی مکمل کے ساتھ ''اور'' لگ ہی نہیں سکتا اگر اس کے ساتھ اور لگا دیا گیا تو یہ آدھا ہو جائے گا جیسے ہم کہتے ہیں سرخ تو اس کا مطلب ہے 100 فیصد سرخ اور جونہی اس کے ساتھ اور لگا دیا یہ آدھا ہو گیا جیسے سرخ اور سفید یعنی آدھا سرخ اور آدھا سفید۔ ہر فرقہ حجۃ الوداع کے خطبے کا حوالہ دیتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ہے کہ میں دو چیزیں تم میں چھوڑ کر جا رہا ہوں جب تک ان کو پکڑو گے گمراہ نہیں ہوگے، کوئی فرقہ کہتا ہے کہ آپ نے کہا ہے قرآن اور میری سنت، دوسرے نے کہا ہے قرآن اور حدیث، فقہ جعفری والے بلکہ بہت سارے سنی حضرات بھی کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا ''قرآن اور اہل بیت''۔ ہر ایک کو سند مل رہی ہے ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے علاوہ امت کے لیے کچھ نہیں چھوڑا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ دین میں کسی اور چیز کو سند قرار نہیں دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے مطابق ہر فیصلہ کیا ہے قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم کی ہے سارا نظام قرآن کریم کے مطابق تھا آج بھی قرآن کریم کے مطابق نظام قائم ہوجائے تو فرقے ختم ہوجائیں گے جو اس نظام کو قبول کریں گے وہ حزب اللہ ہوں گے جو اس نظام کی مخالفت کریں گے وہ حزب الشیطان ہوں گے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات میں کتاب وحکمت کی اصطلاح آئی ہے مگر ایک مقام پر بھی کتاب وسنت نہیں آیا کیونکہ کتاب وسنت کو دین میں سند مذہبی پیشوائیت نے قرار دیا ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ قرآنِ کریم میں کسی مقام پر سنت نبی یا سنت رسول بھی نہیں آیا، اس کے باوجود مولویوں کا سارا کاروبار سنت رسول کے نام پر چلتا ہے بڑی اہم اور گہری سازش تھی قرآن کے ساتھ ''اور'' لگانے کی اس سے اسلام کو بہت شدید نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اللہ کی اطاعت، رسول کی اطاعت اور قرآن کی اطاعت مختلف اطاعتیں نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ہی اطاعت ہے۔

نفیسہ فریاد چاہل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اقبال کا شاہین ہو کہ پرویز کا سلیم

سلسلہ ''اقبال کا شاہین ہو کہ پرویز کا سلیم'' شروع کرنے کا خیال ہمیں آٹھ نو مہینے پہلے آیا تھا۔ جس کا اظہار ہم نے طلوعِ اسلام کی رو سے ایک حضرت سے کیا تو ان کی طرف سے مثبت اشارہ ملنے پر اس پر کام شروع کر دیا۔ پہلے تو سوچا تھا کہ ہر ماہ اس پر جتنا کام ہوا ہوگا وہ چھپے گا اور اس طرح یہ سلسلہ جب تک چلا چلاتے رہیں گے۔ چونکہ اس کا مقصد ان تعلیمات کو ایک جگہ اکٹھا کرنا تھا جو علامہ اقبال اور علامہ پرویز نے مختلف پیرایوں میں بیان کی ہو، مگر موضوع ایک ہی ہو۔ پھر جیسے جیسے ہم اس پہ تحقیق کرتے گئے یہ مزید واضح ہوتا گیا۔ کیوں کہ پرویز صاحب بھی اسی راستے کے مسافر ہیں جو اقبال کا تھا۔ یہ واقعی ایک خوبصورت اقدام تھا جس کا مواد ہمیں وقتاً فوقتاً ملتا رہا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ان دونوں (اقبال اور پرویز) کی سوچ تقریباً ایک ہی طرز پر چلتی ہے کیونکہ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ عوام الناس کو زندہ رہنے کا تحفظ مل سکے۔ جہاں اقبال خودی کی بات کرتے ہیں وہیں پرویز خدا کے احکامات یعنی قرآن کا پیغام انسان کے کان تک پہنچا کر اسے ارفع و اعلیٰ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ماہ کے حصے میں فروری کے شمارے میں شائع ہوئی تحریر کا موضوع ہی زیرِ بحث رہے گا۔ البتہ اس میں کچھ مزید تفصیل سے بیان سامنے آئیں گے۔ وہاں زمین اللہ کی پر مشتمل اقبال اور پرویز کی تعلیمات کو باہم ملایا گیا تھا۔ اس حصے میں دونوں بزرگوں کی تعلیمات کو یکجاں کیا جائے گا۔ پرویز صاحب کی تصنیف ''خدا اور سرمایہ دار'' اور علامہ اقبال کی ''ارمغانِ حجاز'' میں سے نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' سے موقع محل کی مناسبت سے اشعار درج کیے جائیں گے۔ یہاں قوسین میں درج معانی و مفہوم ہماری طرف سے کیا جائے گا۔ پرویز صاحب رقمطراز ہیں: ''انسان نے جب اس اہم مسئلہ (روٹی) کے حل کے لیے مذہب کے دروازے پر دستک دی۔ مذہب سے میری مراد انسان کا خود ساختہ مذہب (جس میں جس بھی انسان کی طرف سے جو بھی بات کہی جائے اس پر عمل کرنا لوگوں کا فرض بن جانا چاہیے اور اللہ کے احکامات پر بغیر تحقیق و جستجو محض ثواب کی نیت سے کان، آنکھیں اور زبان بند کر لی جاتی ہے)۔ تو اس نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا میرا مقصد انسان کو مرنے کے بعد کی زندگی میں عذاب سے نجات دلانا ہے۔ اس لیے دنیا کے مسائل سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔ یہ مادی دنیا کثافت اور غلاظت سے بھری ہوئی ہے۔ اس لیے خدا کے نیک بندوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے قابلِ نفرت سمجھیں اور جہاں تک ہو سکے اس سے دور بھاگیں۔'' (وہ یہ کہہ دیں کہ جن کو خدا نے تنگ دست رکھا ہے یہ اس کا امتحان ہے اور انسان

جس قدر تنگ دست و مفلس ہوگا اللہ کا محبوب ہوگا۔ اس ضمن میں مذہبی تاریخ نکال کر جھوٹی کہانیاں سنائی جاتی ہیں کہ فلاں جناب اس قدر غریب تھے تو وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ واقعہ بارہ سال تک لکڑی کی روٹی پر گزارا کرنے کا بھی سنایا جاتا ہے۔ مطلب اعصاب انسانی تھے اور زندگی آفاقی گزار گئے۔ اس لیے غریب کو صبر کی تھپکی دے کر خود عیش و عشرت کی زندگی گزارنا منبر پہ براجمان حضرت کا اصول ہے) یہاں ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ میں'' پہلے مشیر کی زبانی مسلمانوں کا حال یوں بیان کرتے ہیں۔

ہے ازل سے اِن غریبوں کے مقدر میں سجود اِن کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام

(مگر حقیقت علامہ پرویز ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں) ''اس لیے انسان دنیا سے کتنی ہی دور کیوں نہ بھاگے اور اس طرح ایشور کا کتنا ہی بڑا بھگت کیوں نہ بن جائے، جب تک وہ زندہ ہے کھانے پینے کا محتاج ہے۔ وہ شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں پہاڑوں میں بسیرا کر سکتا ہے مگر خوراک کے مسئلہ سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ (یعنی انسان کی بقا روٹی ہے اور روٹی کمانا ہی اصل عبادت ہے یہ خود فیصلہ کرنا ہے کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے کس راستہ پر چلنا ہے) وہ خواہ چوبیس گھنٹے میں ایک بار ہی کیوں نہ کھائے۔ کھائے بغیر گزارہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بھوک رِشیوں کو بھی لگتی ہے اور پیروں فقیروں کو بھی۔ کھائے بغیر نہ ایشور کے اوتار زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ اللہ کے مقرب۔ اس لیے (انسانوں کے خود ساختہ) مذہب کا کہنا ہے کہ اسے روٹی کے مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہیں (وہ صرف نماز روزے کا ہی حکم دے گا اس سے آگے نہ وہ خود جائے گا اور نہ اپنے ماننے والے کو کبھی بھی جانے دے گا اور اگر ایسا ہو گیا تو اس کے بنانے والے کی ساکھ کو خطرہ لاحق ہوگا) مذہب کے علمبرداروں کو روٹی کے مسئلہ سے اس لیے بھی دلچسپی نہیں ہوتی کہ ان کی روٹی کا انتظام دوسرے لوگ کرتے ہیں۔''

ابلیس کے پہلے مشیر کی زبانی علامہ اقبال کہتے ہیں

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج صوفی و مُلّا مُلوکیّت کے بندے ہیں تمام
مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو ہے وہ سُلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

(یہاں علامہ پرویز صاحب دین اسلام کی تعریف پیش کرتے ہیں اور اسے سارے مذاہبِ ارضی سے ماورا قرار دے کر قرآن کی رو سے مسلمان کا طریق بیان کرتے ہیں)

وہ ''خدا اور سرمایہ دار'' میں لکھتے ہیں: ''اسلام مذہب نہیں بلکہ الدین ہے۔ جس کے معنی ہیں نظامِ زندگی یا ضابطہ حیات۔ ظاہر ہے کہ جس نظام کا دعویٰ ہو کہ وہ انسان کی ساری زندگی کو اپنی آغوش میں لیتا ہے اور جو ضابطہ حیات انسانی زندگی کے ہر گوشے کے لیے راہنمائی دینے کا مدعی ہو، وہ انسان کے معاشی مسئلہ سے کس طرح چشم پوشی کر سکتا ہے؟ وہ روٹی کے سوال سے کس طرح آنکھیں بند کر سکتا ہے؟'' (دین اور دنیا کو یکسر دو مختلف موضوعات نہیں مانا جا سکتا دین ہی کے بل بوتے پر وہ دنیا ہے مردِ مومن کو جس کے سنوارنے کا حکم دیا گیا ہے) مگر یہاں حال یہ ہے اسی دین کو مذہب کی قبا پہنائی گئی ہے)

علامہ اقبال بانگِ درا میں فرماتے ہیں ؎

اے شیخ و برہمن، سُنتے ہو! کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں گردُوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبّت قائم تھا یا بحث میں اُردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

اے شیخ و برہمن سنتے ہو! کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا یا بحث میں اردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے اگر یہاں علامہ پرویز صاحب اسی بات کو نثر میں بیان کرتے ہیں تو ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے ایک مضمون میں بھی عرض کیا تھا کہ شاعر بچ جاتا ہے مگر ادیب عام عوام کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ اب بھولے بھالے لوگوں پر منحصر ہے کہ وہ اس کو کیا نام دیتے ہیں۔ اس سے آگے علامہ پرویز لکھتے ہیں: ''چنانچہ قرآن نے اس مسئلہ کو پوری پوری اہمیت دی ہے اور اس کا آسان حل بتایا ہے۔ جو ان پریشانیوں کو آسانی سے دور کر دیتا ہے۔ جو انسان کو جہنم کے شعلے بن کر چاروں طرف سے گھیرے رہتی ہے۔ قرآنِ کریم نے معاشی مسئلہ کو کس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کہا ہے کہ جس قوم کو رزق کی فراوانی حاصل ہو، سمجھو کہ اس پر خدا کا انعام ہے اور جو بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو، اس پر خدا کا غضب ہے۔ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا: خدا تمہیں مثال دے کر ایک بات سمجھاتا ہے۔ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ: ایک بستی تھی جو نہایت امن و اطمینان کی حالت میں تھی۔ اس کے کھانے پینے کا سامان (رزق) ہر جگہ سے بافراغت اس کے پاس چلا آتا تھا۔ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ: اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکر گزاری کی، تو ان کے اس جرم کی پاداش میں فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (112)۔

اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔ یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا۔

آپ نے مذہبی حلقوں سے اس قسم کے فقرے سنے ہوں گے کہ انسان کو ہمیشہ احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیے۔ جو شخص خدا کی نافرمانی کرے اس پر اس کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان سے پوچھیے کہ وہ عذاب کیا ہوتا ہے؟ تو وہ کہہ دیں گے کہ اس قسم کے انسان کو (صرف ایک انسان کو، حالانکہ جب معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار وہاں کا ہر انسان ہوتا ہے نہ کہ صرف ایک انسان) مرنے کے بعد جہنم میں بھیج دیا جاتا ہے۔ (یہاں کچھ لوگ قبر کے عذاب کو بھی عذابِ الٰہی کہتے ہیں مگر یہ بالکل باطل نظریہ ہے۔ اللہ قرآن میں اس کی تصویر کشی سورت یسین میں کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ

مفہوم القرآن: ''جب صور پھونکا جائے گا تو وہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور کہیں گے ہمیں ہماری نیند سے کس نے جگایا؟'' اب اگر کسی کو قبر کا عذاب ہو رہا ہے تو وہ یہ تو نہیں کہے گا کہ ہمیں ہماری نیند سے کس نے جگایا کیونکہ نیند تو آرام کی

حالت میں ہوتی ہے) اور وہ وہاں خدا کے عذاب کا مزہ چکھتا ہے۔ لفظ جہنم کے معنی و مطالب علامہ پرویز صاحب کسی اور جگہ بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ جو اس طرح ہے: سوچیے قرآن سے جہنم کی تفصیل کہ ''اس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں۔ تو پہلی چیز یہ آ گئی کہ جس معاشرے کے اندر کسی ایک انسان کی بھی عزتِ نفس محفوظ نہ رہے۔ اس کی شرفِ انسانیت، سوختنی قربانی کی طرح ان کی بھینٹ چڑھا دی جائے، اوپر والوں کی۔ تکریمِ انسان سے ایک بھی (محروم) ہو جائے۔۔۔۔۔ وہ معاشرہ جہنم کا معاشرہ ہے۔'' اندازہ لگائیں کہ انسان کی عزت ہر حال میں ہمارے دین کو کتنی محبوب ہے۔ جبکہ نظامِ سرمایہ داری میں سب سے زیادہ توہین اسی محبوب چیز کی ہوتی ہے۔ یعنی زمین اللہ کی ہے تو حقیر کوئی بھی انسان کیوں ہوتا ہے؟ اس نظام کو ابلیسی نظام کہنا بجا ہے کیونکہ یہ ہر انسان کی مایوسی کی وجہ سے نافذ العمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ بیک وقت دو گروہ دنیا میں ہوتے ہیں۔ اس نظام میں ایک وہ گروہ ہے جو اسے نافذ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے صرف اپنی اور اپنی اولاد کی حکمرانی چاہتا ہے اور دوسرا گروہ وہ جو اسے مانتا ہے اور اس کے بنانے والوں کا غلام بنتا ہے۔

اقبال نے شاید علامہ پرویز صاحب کے لیے ہی ابلیس کے تیسرے مشیر کی زبانی یہ کہلوایا تھا۔

میں تو اس کی عاقبت بینی کا کچھ قائل نہیں
جس نے افرنگی سیاست کو کیا یوں بے نقاب

بات یہ کہ انہوں نے کتنی خوبصورتی سے قوم کو قرآن کا اتباع کرنے والا بنا کر اس کو ذلت کی زندگی سے نکالنے کی اتنی محنت کی کہ اس پر حیران ہوئے بنا نہیں رہا جا سکتا اور بدلے میں انہوں نے صرف ایک خواہش کی کہ: ''اگر میں مرتے وقت دو چار سلیم اور دو چار طاہرہ جیسی بیٹیاں بھی چھوڑ گیا جو اس ننھے دیئے کو جلائے رکھیں، تو یہ میری جگر کاویوں کا صلہ ہو گا۔''

یہاں اقبال بھی اپنے الفاظ میں خدا سے التجا کرتے ہیں۔

''میرا نورِ بصیرت عام کر دے''

قارئین کرام! یہ تھے وہ مردِ مومن جن کی خواہشات و تمنائیں اسی قوم سے شروع ہو کر یہیں کی ہو گئیں۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ختم ہو گئیں؟ اب ہمیں انصاف دو کہ ہمارے ان دو حکماء کی آرزوئیں کوئی بغیر کسی بدلے کے لالچ میں صرف قوم کی ڈوبی کشتی کو پار لگانا تھی تو اقبال کو محظ اس بات پر کہ وہ ان (پرویز پر تنقید کرنے والوں) کی سمجھ میں نہیں آ سکا، اور جو صاف سیدھی بات کرتا ہے وہ ان کا قصوروار ہو گیا۔۔۔۔

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمد
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے؟

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہوچکی ہے۔ یہ جلدیں 20X30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	ہدیہ
سورۃ الفاتحہ	(1)	240	200/-
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-
سورۃ البقرہ (اوّل)	(2)	500	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-
سورہ آل عمران (اوّل)	(3)	472	500/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-
سورۃ الانفال	(8)	210	250/-
سورۂ توبہ	(9)	530	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-
سورۂ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-14-15)	500	500/-

سورۃ النحل	(16)	334	300/-
سورۃ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-
سورۃ الکہف، سورۃ مریم	(18-19)	532	500/-
سورۃ طٰہٰ	(20)	416	350/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ العنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ روم، لقمان، السجدہ	(30-31-32)	444	400/-
سورۃ الاحزاب، سبا، فاطر	(33-34-35)	570	400/-
سورۃ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ الصٰفٰت، ص، زمر	(37-38-39)	450	400/-
سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40-41-42)	624	550/-
سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45-46-47)	520	500/-
سورۃ الفتح، الحجرات، قٓ، الذاریات، الطور، النجم	(48-49--51-50-52-53)	550	500/-
سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55-56-57)	384	400/-
28واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	-64-65-66) (58-59-60-61-62-63	300	300/-
29واں پارہ (مکمل)		544	400/-
30واں پارہ (مکمل)		624	400/-
شرح جاوید نامہ		800	1000/-
فہرست موضوعات مطالب القرآن فی دروس الفرقان		800	1000/-

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 4: Builder of Kaaba (*Mei'mar Haram* - معمار حرم) –

To leaders of Spring's caravan

(Tulu-e-Islam Convention, April, 1960)

By G. A. Parwez

In gathering of believers, I know this is what delights me?
One brotherhood, one Iman, one path, and one mission!

My dear brothers, *Assalaamu Alaikum wa Rahmatullah*!

Immediately after the celebration of *Eid-ul-Fitr* – what we call "*Jashn-e Nuzul-e Quran*" (the celebration of the revelation of the Quran) – to be gathered together here in shining setting like this suffused with fragrance of deep love has created deep happiness in our hearts and minds, as if this beautiful environment of the convention hall is whirling with joy and saying:

Who has graced this gathering of exquisite love and magnificence?
That has made the entire environment turn into youthful exuberance!

Let me first offer my heartfelt congratulation to you on the occasion of this happy gathering. Gatherings like this, in fact, make my desires young and my feelings warm; and they invigorate my emotions, and strengthen my determination in my Quranic Journey. So, I am deeply thankful to you with all my heart and sincerity!

My dear friends, from our point of view, the most important event of last year has been the formation of a constitution commission charged with proposing recommendations for a new constitution of the state of Pakistan. This is the constructive step after the destructive step that was taken about one and half years ago when the Martial law authorities declared the current constitution null and void. The formation of the commission is the beginning of this constructive step. After the creation of Pakistan the framing of its constitution was handed to the constituent assembly. That assembly was not a true representative of the people of Pakistan, and so, the people of Pakistan didn't have any say in the creation of the constitution that was adopted then. The current commission has declared that it will issue a questionnaire to people of Pakistan to get their input regarding the type of constitution they want. The questionnaire has not been issued yet. So we cannot say whether it will be limited to asking people's opinions about only the constitution's basic principles or will it also include some details about the proposed constitution. But even if it is limited to only the basic principles it will be sufficient for the goal that we have in front of us. It is because our belief is that the constitution of the state must be according to the Quranic outlines. The Quran provides the permanent principles within which details can be worked out. So, if our

proposed constitution is according to Quran's basic principles then there is no need to worry about the details.

What is the importance of constitution to a state? – About this you are quite well aware of. And there is no need to go into details about it. A state's constitution is the lifeblood of its citizens. It impacts not only the present generation but the future generations as well. This is the case with any constitution. But the importance of the Quranic constitution for a state goes much beyond this – it turns that state into a model state for the entire world. It tells the world by perceptual means that when social life of humans is molded on the Quranic pattern then how the world becomes heaven on earth? This is our conviction – and this conviction is based on reason and deep understanding – that if Quranic constitution becomes the state constitution of Pakistan then other nations of the world would leave their systems and will adopt the Quranic system by seeing its shining results. And the heaven once again will see the scene of: يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ (110:2) – People joining the Divine Order in groups, one after the other.

When the passionate devotee rose up carrying the cup of Iman's elixir;
Then everyone started shouting: Bring it first to me, bring it first to me!

My friends, everyone can realize that the nation is going through a critical period now. But this is not the case only with Pakistan. It is no secret that great powers are also going through distress, anguish, and trail and tribulations. Their nature of difficulties and troubles may be different compared to weaker nations but they are facing their own challenges and difficulties nonetheless. So, nowhere there is peace and tranquility. The authorities in Pakistan are trying their best to improve the situation but they are facing hardship and difficulties at every step. The society has become so degraded and corrupted and the problems so numerous and challenging and so out of control that they seem impossible to solve. But these problems cannot be solved individually. The root cause of all the symptoms is only one. There is no need to put ointment on every boil of the smallpox. The solution is to attack the root cause of the disease with proper prescription. That is, the disease of the human society can be cured only with prescription of the absolute Creator. So, instead of trying to treat umpteen boils of the smallpox of the Pakistani society, we appeal to the official authorities to adopt the Quran as the single prescription. They will see then how these thousands of symptoms get cured with this single prescription. The Quran has sketched the picture thus of the world at the time of its revelation: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (30:41) – there was chaos and disorder everywhere in land and water – i.e., there was chaos in walks of life. Nothing was at its proper place. The Prophet (PBUH) did not treat the individual

symptoms of the sick society. He established a state and enforced the Quranic constitution in it; and all the symptoms automatically disappeared. In fact, the humanity saw a life of such accomplishment and wellbeing that is unparalleled in human history. This is the Sunnah of the Prophet (PBUH) and that is the role model for us. Let the Quranic constitution get enforced in the state of Pakistan and you will see how the environment turns into a lively season of spring from its eternal dead season of fall:

Don't worry O devotee; let the spring come!
Heaven will spread, flowers will blossom!

This is how heavenly society is created on Earth: كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (2:73) – thus Allah turns dead into alive if only you could use your intellect to observe His signs.

But my dear friends, the biggest responsibility falls on you in this regard. At this time only from your side the voice of the Quran – as *the* constitution of life – is being raised not just in Pakistan but in the entire world. The Nature had graced this great gift in your hands. But, for this, the Nature demands great sacrifice. It never reveals its heavenly pearls of gifts without extracting a huge price in terms of perseverance, hard work, and relentless struggle. When it opens the beast of a fortunate person then it loads him up with backbreaking burden of responsibility whose interpretation is summed up by these verses:

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ

(93:1-6) – O Prophet (PBUH)! This strengthened your heart so much that difficulties which seemed almost impossible to overcome started appearing to be easily surmountable. You became much more courageous and your spirits soared. At this time in the initial stages of this program when you alone had to face tremendous hardships your back almost gave way with the weight of responsibilities. However, gradually the number of your companions increased due to which your burden lessened. Initially nobody was prepared to listen to you seriously. Instead all kinds of accusations and ridicule were hurled at you, causing much distress and anxiety. But gradually the situation changed and now your very name is being mentioned with dignity and reverence. Your fame has spread to far-off places and the message of Quran has attained an exalted position. The earlier hardships of life in Makkah were eased by the advent of Hijrah. Now the opponents have started waging wars against you. This has created new difficulties, but you will see that even after these hardships there shall be ease and comfort. This in fact is a principle of life, that for those who in the beginning face hardships with fortitude and steadfastness, later on there shall be ease and comfort.

This is a path of passionate love in which:

The more the difficulties keep on increasing in the seeker's way;
The more his heart is sure of reaching the destination of his way!

One should increase one's speed the more difficult the impediments one finds in his way of Quranic journey. This is the way for which it has been said:

Increase the pitch of your melody if its taste does not seem sweeter;
O rider! Increase the sound of your voice if howdah seems heavier!

But there is one prerequisite for travelling on this path: one cannot travel on this journey by using only emotion. The fact is that an emotional personal cannot accompany on the Quranic journey. The Quran has described its path as الْعَقَبَةُ (*Al-'Aqabatu*) – that is, to climb a hill. The only role emotion plays in climbing a hill is to provide a firm determination that, yes, I want to climb the hill. After that the phase of extreme patience, perseverance, and fortitude begins. The way up the hill can be covered only by advancing step by step. One cannot run to the top of the hill. Therefore, there is no place of emotion during the course of this journey. Courage, determination, and self-restraint – these are qualities that will arm you in your conviction to continue this journey. Whether or not one reaches the final goal – the top of the Quranic hill, i.e., the establishment of the Quranic society – in one's lifetime is not important. One should not even entertain this thought in one's mind – to see the final goal. The important thing is that one needs to continue this journey nonstop – so much so that even the leader of the passionate human caravan, the Prophet (PBUH) was told: وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) –O Prophet (PBUH), you might wonder whether the end of which your opponents are being warned will come about in your life time or whether you will spend your whole life in these struggles. The end will come according to Our Law of Requital. Your responsibility is only to communicate the message with full confidence that they will be recompensed for their actions since it is Allah Who keeps a watch over what they do.

There is no doubt that the results of this continuous struggle had started to appear during the lifetime of the Prophet (PBUH) but there were many companions who did not see the heavenly results of their struggle in their lifetime. In their share was only sacrifice after sacrifice – and the ultimate sacrifice of life. These companions could not see the fruit of their sacrifice during their lifetime. But the value of their sacrifice in the eyes of Allah was much more than those who joined the struggle later and saw the fruits of their struggle with their own eyes: لَا يَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ (57:10) – Remember that those who strive for the establishment of the Divine Order without waiting for its results and accordingly keep their wealth open and available; and if required come out on to the battlefield – they

certainly are "pioneers". Their status is higher than those who join this Order after it has been established and they have seen the results. In other words, those who had kept their wealth open even before this system was established and were ready to die for it, cannot just be equal to those who did so afterwards. They are: وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ – They were first and foremost in accepting Islam; and their rank is very high.

Therefore, my dear friends, do not be disappointed if the results of your efforts do not appear in front of your eyes. This road is quite long and the goal extremely difficult. If such thoughts are popping up in your mind that "we have been working so hard but the results are not appearing," then know that you have really not understood the Quranic movement. On the part of the pioneers in this movement there is only continuous struggle, difficulties, and only more difficulties. They only sow the seeds of the Quranic thought and who knows who will harvest the crop. As for what we will get out of this continuous struggle – this is not something that can be explained rationally but can only be felt in the heart. Those who have this feeling know what the results are for treading on the path of truth and reality? They get a higher feeling in traveling itself on this path than would be the case in reaching the destination.

Throbbing, and not reaching the end, has its own taste;
Be happy that you're travelling behind the howdah of Layla!

The conviction in the truth of one's goal; belief in the proper way to reach that goal; and the company of trustworthy, sincere, and committed travelers – these are the treasures by themselves in the Quranic journey; so, what more one could wish for?

Don't be sad that the bud is new; it is the beginning of the garden what more do you wish?
There's river's edge, flowery garden, chirping birds; cool breeze, morn's dew, and melody!

The Quran reminds: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (3:14) – that is the treasure of worldly life. And: وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (87:17) – the Hereafter is better and everlasting. Tell your opponents: You give preference to the worldly gains of this physical life, although future gains would be better and everlasting. In other words, when you have to choose between physical needs and permanent values, then the proper behavior would be the preservation of the latter. Physical needs should be sacrificed. This will nourish and develop human self; and future life would be eternal and successful.

My dear friends, as I mentioned, this is an extremely challenging time for you. I think that the law commission won't take much time in proposing its recommendations. You don't have much time and there is lot of work to do.

The program in front of you is that prorogate this Quranic thought as much as possible. I have compiled the principles of Quranic constitution in one pamphlet. Please make this and other pamphlets available to as many hands as possible. And those who agree with Tulu-e-Islam's position on the constitution after due thought and proper understanding, then please tell them to provide their feedback via the questionnaire to the law commission; and tell them to also provide this information to the government as well. If this Quranic voice could reach the law commission and to government official from every corner of Pakistan then it will be a great success on your part. This is an age of democracy. When a democratic and constitutional step is taken regarding an issue then it is going to produce result. I have so much faith in the truth of this message it is as if I see its success with my eyes:

My constant heartfelt ache will create strong inspiration;
Every individual of this nation will be filled with passion!

In this connection there is one more thing worth noticing. As you would have seen in the editorial of the April 1960 issue of the Tulu-e-Islam magazine, the age of self-created religion is disappearing. Demands of time are moving fast by trampling over any life-system that cannot keep pace with time. And Pakistan cannot remain unaffected by this environment. It is the result of this that (especially) the educated youth are turning away from religion. If the Quran's voice could reach them at this time then they will come to the دین (*Deen*) by deserting religion. Otherwise, they will land in lap of atheism or communism. And you can very well imagine what the result will be then. If you see from this point of view then also it is extremely important to spread the Quranic thought. In this audience there are many whom I know would have gone – God knows where by being fed up with religion – if the Quran's thought had not reached them.

If the Quran's voice wasn't available to those coming out of temples and mosques;
Then the suffering and snubbed human beings, God knows where would have gone?

Therefore, my dear friends, the responsibility for showing the way to those fed up with religion has fallen on your shoulders. There is no group at this time besides yours that is delivering the message of the pure دین (*Deen*) of Allah. But this is not something that everyone can do:

The treasure of love is not meant for everyone; Love is not conducive for everyone to work for!
Tulips will go to those who have aching-heart; the heart of the diamond is without the fiery fire!

Leave aside inviting them to the pure دین (*Deen*) of Allah, the majority of the people are not even willing to listen to the Quran, thanks to our religious priesthood. If you go to them with the message of the pure Quran they say:

We feel very peaceful in the darkness of the night;
Don't mention before us, the shine of morn's light!

But due to loud cry of bats, the sun does not stop rising. It does rise with full sunshine on its appointed time. The demands of time are telling clear and loud that it is time for the dark night to disappear into the blazing light of the morning's sunshine:

The time for lifting the curtain before the public has arrived!
The mystery hiding behind the curtain will surely be revealed!
The time has passed now that believers used to invite secretly;
The entire world will be its realm, everyone will be a believer!

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (61:8) – Do you think that with such attitude and actions you can extinguish the Divine Light (the Quran)? You can never succeed in your designs. Just imagine! Can they ever extinguish the light of the sun by just blowing at it? Allah is determined to make His light perfect and make it spread all over the world, regardless of how much the non-believers may detest it (9:32).

****

My dear friends, when I say that the grip of religion is getting looser then I am only stating a fact of life; and it is not my fantasy. But please understand that by "religion" I mean self-crafted ideologies and beliefs, not the revealed دین (*Deen*) of Allah. History tells us that whenever the influence of one religion diminished anywhere another religion filled the vacuum. But the disgust of religion per se at such a large scale that is happening now had never occurred before in the history of humankind. This is a clear proof that humanity is coming out of its childhood phase and entering its adulthood stage. Now, human beings cannot be frightened by the will-o'-the-wisp superstitious beliefs nor can it be entertained by ambiguous toys of hopes. Now, humans demand proofs and logic about the truth of every claim; and tend to accept it on the basis of knowledge and understanding only. The tired old technique of providing so-called "proof" is not going to work anymore, such as: Keep following the path of your ancestors blindly; and keep doing what they did in the name of religion to achieve salvation. The children of Adam are reaching their adult period of humanity. This is the reason that globally the grip of self-crafted religion is getting looser. This is a message of death for the religious priesthood. So, all their lamentations and cries are understandable. But the same thing is joyous news for the supporters of Allah's دین (*Deen*). The

downfall of religion is a sign of progress for دین (*Deen*); and demise of orthodoxy is a sign of truth's liveliness.

The flickering of stars is a sign of morning;
Sunrise in the horizon is end of dreaming!

The psychological state of fear on the faces of the custodians of religion; their unkempt hair and dirty getup; their shouting and becoming angry and restless at every step; their loss of composure – all these are signs that their disease is incurable; and they are amorously telling each other:

The reign of Almighty Allah is ipso facto;
Nnow there is no hope for cure of our ills!

On the other hand, the same thing is a sign of optimism and good news for the followers of دین (*Deen*), who, by looking at this scenario, conclude:

These setting of stars; this sad face of the moon;
The state tells the morn is bound to come soon!

My observation tells me that the world is about to enter the stage about which the Quran has said: يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) – The great revolution will occur in this way, and humankind will rise to establish the Divine order of universal sustenance. And: يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (82:19) – That will be the period when everyone will see his deeds in front of him. Neither will anyone be able to do anything for the other; nor would one have any authority over the other. All power and authority will rest with the Divine Laws; and only these laws will prevail. In other words, a human being will neither be subservient to any other, nor will he be needy. No one will be able to save any criminal from the punishment for his crime. This will be the period of دین (*Deen*).

This is the period whose arrival the Devil (Iblis) had sensed and told its agents (in the words of Iqbal):

The demand of modern times makes me really afraid;
That Prophet's life's role model may become revealed.
Beware! Hundred times beware of the Prophet's life's model;
It guards women's honor, drives man to lift up humanity.
Its message is death to those who want to enslave humanity;
There is no kingship is this system, nor the system of beggary.'
Its system purifies the wealth from every form of corruption;
It makes the rich the trustees of its people's wealth and welfare;
What could be a bigger revolution in thoughts and deeds?
That this Earth belongs to Allah, not to rulers and kings!

This was the fear about which Iblis was afraid of. So, he told his advisors to make sure:

That this divine idea remains hidden from world's eyes;
It is good that the believer himself is devoid of true belief.
It is better for him to remain lost in the maze of metaphysics;
That he forever be lost in the interpretation of the divine Book.

Then Iblis advised his agents:

The clarion call that once broke the riddles of our hegemony;
Make sure that the dark night of the God-conscious never ends.

To achieve these goals the Devil Iblis gave a program to his followers (the custodians of religion): to entangle people from their religious pulpits in abstract and trivial religious matters such as:

Is the son of Marry dead, or is he eternally alive?
Are the attributes separate from God, or they aren't?
Is the one who is supposed to come, is he Jesus?
Or, is he someone who will have Jesus's attributes?
Are the words of the Quran new, or are they ancient?
In which ideology is the salvation of the dead Ummah?
Aren't these enough for the Muslims of this period?
All these idols sculpted from the metaphysical world!

These custodians of religions are busy encircling their sculpted idols and the devil has commissioned his agents in full force to keep shooting tranquilizer darts filled with these subliminal messages at people so that they become totally unaware of the real actions of the real world. The devil tells his agents:

Make man stranger to the world of facts and deeds;
So that in playing field of life-action all his steps fail!
Make only that poetry and Sufism attractive for his life;
Which hide from his eyes the realm of actions of real life?

Despite all this brainwashing of the Ummah by his agents, the devil being still afraid of true believers he expressed his incessant fear thus:

But I fear in my every breath that this Ummah may become awake;
Because the reality of its دین (Deen) is accountability of entire Life!

So, he tells his agents:

Keep them busy reciting Allahu every morning;
Make them habituated to monastic way of living!

To Be continued....

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔



(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)



PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.78
ISSUE
03

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/idaratolueislam1/ www.youtube.com/idaratolueislam

